بحر اوقیانوس
پرتگال
گلیشیہ
استوریہ
لیون
کورونیہ
اورنسہ
زمورا
سلمنکہ
اویلہ
مارده
اشبیلیہ

سرزمین اور باشندے

ہسپانیہ

ہسپانیہ

سرزمین اور باشندے

تصنیف :— مسز ڈارتھی لوڈر

ترجمہ :— سید ہاشمی فرید آبادی

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

کشمیری بازار	نذر باغ	ہسپتال روڈ	بندر روڈ	اُردو بازار
لاہور	پشاور	حیدر آباد	کراچی	لاہور

This is an authorized Urdu translation of THE LAND AND PEOPLE OF SPAIN by Dorothy Loder. Copyright 1955 by Dorothy Loder. Published by J. B. Lippincott Company, New York, N. Y., U. S. A.

FIRST EDITION
Printed in Pakistan

طابع	شیخ نیاز احمد
مطبع	علمی پرنٹنگ پریس لاہور
طبع اول	سنہ ۱۹۶۴ء
تعداد	دوہز [illegible] سو
قیمت فی جلد	[illegible] ے

ناشر

شیخ غلام علی اینڈ سنز، کشمیری بازار لاہور

باشتراک

مؤسسۂ مطبوعات فرینکلن لاہور — نیویارک

فہرست

تعارفِ کتاب

ہسپانیہ

سرزمین اور باشندے

(مع نقشہ و تصاویر)

سپین عجیب طرح کا جامع اضداد ملک ہے۔ اس میں افسردگی اور شگفتگی، ویرانی اور سرسبزی، روکھاپن اور دلکشی، تن آسانی اور سرفروشی، دونوں قسم کی صفات موجود ہیں۔ اس کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ ہزاروں سال پہلے ہم ایبری، سلٹ، قرطاجنی اور یونانی قوموں کو یہاں آتے اور قدم جماتے دیکھتے ہیں۔ تاریخی دور میں دولت رومہ، غوطی قوم اور پھر مسلمان غازیوں کا اس ملک کے اکثر اقطاع پر تسلط قائم ہوتا ہے۔ آخر میں دیسی عیسائی مل کر وطن کو اجانب سے آزاد کراتے ہیں اور وحشت انگیز خوں ریزی اور جنگ و جدال کے بعد ایک آزاد اور فی الجملہ متحد قوم کی تشکیل ہو جاتی ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں اس تمام سرگزشت کا خلاصہ اس سلیقہ سے پیش کیا گیا ہے کہ سپین کی تاریخ کا اجمالی خاکہ خاصی صفائی سے پڑھنے والے کے ذہن میں اُتر آتا ہے۔ مسلمانوں یا موروں کا دَور پاکستانی قارئین کو کسی قدر تشنہ نظر آئے گا۔ اور علم و فن میں ان کے کارناموں کا تذکرہ جس طرح انصاف و صحت سے کیا جانا چاہیے تھا، شاید اس کی کمی دل میں کھٹکے گی۔ لیکن اس خاص موضوع پر اور بہت سی مستند اور مفصل کتابیں موجود ہیں۔ اردو خواں حضرات چاہیں تو ان سے اپنا شوق مطالعہ پورا کر سکتے ہیں، پھر بھی مترجم نے کتاب کے باب سوم کے آگے چند ضروری حواشی اور ایک ضمیمہ خود لکھ کر شامل کر دیا ہے۔

نئی دنیا یا امریکا کی دریافت کا سہرا اسپین کے سر ہے۔ اسے اہلِ یورپ کی نوآبادی بنانے کا دشوار کام سپین والوں نے ہی شروع کیا اور وہاں کے وسیع اقطاع دریافت اور بزورِ فتح کرنے میں بڑے خطرے مول لیے۔ موجودہ اہلِ امریکا قدرتی طور پر سپین کے احسان مند ہیں اور اس امریکی تصنیف میں بھی یہ احساس و اعتراف کارفرما نظر آتا ہے۔ اس طرح دورِ جدید کے سپین کی معاشرت، وہاں کے علوم و فنون، کھیل تماشے، ذوق شوق، وہاں کے مشہور بادشاہ، شعراء، مصوّر ادیب —— ان کا حال خاصی تفصیل اور قدر شناسی کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر کتاب ایسی مفید و دل چسپ ہے کہ اسے پڑھ کر خوشی ہوتی ہے۔ سپین کا ایک نقشہ اور چند عکسی تصویریں کتاب کی افادیت اور دلچسپی میں اضافہ کرتی ہیں۔

مسز ڈارتھی لوڈر

(مُصنّفہ کتاب)

اس کتاب کی لائق مصنفہ ڈارتھی لوڈر، سان انتونیو (ولایت ٹکساس) میں پیدا ہوئیں۔ ٹکساس یونیورسٹی سے بی۔اے کرکے نیویارک جامعۂ کولمبیا میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ پھر براؤن یونیورسٹی (جزیرہ روڈز) اور پیرس کی دانش گاہ سبراؤں میں علمی کام کرتی رہیں۔ فرانسیسی، ہسپینی اور جرمن زبانوں میں درس دینے کا کام بھی انجام دیا اور یورپ خصوصاً ہسپین کی سیاحت میں بہت سا وقت صرف کیا۔ وہ بہت اچھی انشا پرداز اور شاعرہ ہیں۔ ان کے مضامین اور نظمیں امریکی جرائد میں چھپتے رہے ہیں۔ تین کتابیں تصنیف کرچکی ہیں۔ زیر نظر کتاب کو ان کے ذاتی مشاہدات اور اہل ہسپین سے گہری واقفیت نے نہایت دلچسپ اور پُرمغز بنادیا ہے۔

مسز لوڈر اور ان کے شوہر اب ان کے وطن سان انتونیو ہی میں سکونت رکھتے ہیں۔

سید ہاشمی فریدآبادی
ماڈل ٹاؤن لاہور

باب اوّل

ایک جداگانہ دُنیا

یورپ کے نقشے میں سپین کو دیکھیے تو نپولین کی اس بات کا کہ یورپ کوہستان پائی رین پر ختم ہوجاتا ہے کچھ مطلب سمجھ میں آجائے گا۔ جزیرہ نمائے ایبیریہ (Iberian Peninsula) جس کا صرف ایک خمس یعنی پانچواں حصہ پرتگال ہے، اور باقی سارا جزیرہ نما اسپین کہلاتا ہے، برِاعظم یورپ کے چوکھٹے میں ٹھیک ٹھیک نہیں بیٹھتا بلکہ پائی رین کے پہاڑوں سے جنوب مغرب کو کھنچا ہوا ہے اور ایک اونچے جہاز کی طرح سمندر میں بڑھے چلا جاتا ہے۔ ادھر وہ پہاڑ بلند ہوکر فرانس کے مقابلے میں فصیل بن گئے ہیں۔

خود ملک سپین ایک جداگانہ دنیا کا سماں دکھاتا ہے۔ یہ ظاہر و باطن دونوں طرح اضداد کا مجموعہ ہے: شگفتہ، افسردہ۔ظالم، بامہر۔ بنجر، سرسبز۔ برفانی، آتشیں۔ خواہ آپ اندرون ملک میں سرحد فرانس کے ایرون سے برشلونہ تک سفر کریں یا اوقیانوس پار کے جہاز میں شمال مغرب کی بندرگاہ لاکرونہ پر اُتریں یا جنوب کے شہر قادس تک آئیں۔ ملک پر نظر پڑنے کے بعد جلد ہی آپ کو احساس ہوگا کہ سپین معجونِ مرکب ہے اور نہایت غیر معمولی نوعیت کی سرزمین ہے۔

ایرون اضلاع باسک (Basque) میں واقع ہے۔ یہ یورپ کی پر اسرار قوم باسک کا وطن ہے۔ ریل کی کھڑکیوں سے آپ کو اس خوبصورت ملک کے، جو گہرے پہاڑی نالوں، تیز رو نیچے اُترتی ندیوں سے سیراب ہے، مناظر، پتھر اور کڑیوں کے پُرانے مکان جلد جلد گزرتے نظر آئیں گے۔ سڑکوں پر

گولر، انجیر، بید مجنوں کے درخت چھائے ہوں گے۔ ڈھلوان کھیتوں میں کسان چھوٹے چھجے کی گول ٹوپیاں اوڑھے کام کرتے ہوں گے۔ ہر صاف ستھرے گاؤں میں جس سے آپ گزریں گے "پلوٹا" (یہ گیند) کھیلنے کا کھلا میدان ضرور ہوگا۔ یہ باسک قوم کا وہ جوش انگیز کھیل ہے جس میں گیند کے لیے دوڑتے ہوئے سیدھی دیواروں تک پر لوگ دوڑتے نظر آتے ہیں

اگر آپ لاکرونہ میں اُتریں تو یہ سپین کی سب سے شمالی مغربی ولایت (جلیقیہ) گلیشیہ کا علاقہ ہے جہاں پہاڑ، کہر اور بارش کی کثرت دیکھ کر آپ کو آئرلینڈ یا سکاٹ لینڈ یاد آئے گا، پہاڑ کے پہلوؤں پر اوپر گیہوں اور نیچے میدانوں میں غلہ اور سیب ہوتا ہے۔ پہاڑیوں پر اخروٹ، چھالیہ، بلوط اور سفیدے کے درختوں میں جنگلی گلاب کھلتا ہے اور بنجر زمینوں میں اریکا جھاڑی کے پھولوں سے دور دور تک گلابی رنگ کی جھلک آجاتی ہے۔

برشلونہ ولایت کتالونیہ (عربی: قیطلونیہ) میں اسپین کی صدر بندرگاہ اور سب سے بڑا تجارتی مرکز ہے، یہاں وسیع خیابان، شاندار مناظر کے ساتھ اشتہاروں کے زور شور، پرتکلف ہوٹل اور بہت سے کارخانے اسے یورپ کے ترقی پذیر شہروں سے مشابہ دکھاتے ہیں۔ قیطلونیہ والوں کا قول ہے کہ نپولین کا یہ کہنا کہ پائی رین پر یورپ ختم ہو جاتا ہے، درست نہیں۔ اُسے یورپ کی آخری سرحد قیطلونیہ کے عین جنوب تک بتانی چاہیے تھی۔ وہ جنوبی فرانس کی ولایت پرووانس کے لوگوں سے اپنا رشتہ اور وہاں کی بولی سے اپنی قیطلونی کی مماثلت یاد دلائیں گے اور یہ کہ ولایت کا نام بھی فرانس وسطیٰ میں فرانس والوں نے ہی کتالونیہ یعنی قلعوں کی سرزمین رکھا تھا کیونکہ اس دَور میں یہاں ہر پہاڑی پر کوئی قلعہ بنا ہوا تھا۔ ان میں اکثر اب کھنڈر ہو گئے ہیں۔ اگرچہ نہایت

خوش منظر ہیں۔ بعض کسی زمین دار کے مزرعے کا حصہ ہیں لیکن اکثر غیر آباد پڑے ہیں قلعوں کے میدانوں میں جہاں کہیں بادشاہوں کی سواریاں نکلتی تھیں، اب بکریوں کے ریوڑ چرتے پھرتے ہیں اور بے چھت کے گرجوں میں انجیر اُگ آئے ہیں۔ قیطلونیہ کے آباد قصبوں میں سفیدی کیے مکانوں کی کھڑکیاں اور دروازے، عموماً شوخ سبز یا اودے رنگ کے بڑی بہار دکھاتے ہیں۔ یہ قصبات اکثر وہاں واقع ہیں جہاں کبھی کوئی قدیم یونانی، رومن یا غوطی (Visigothic) بستی آباد تھی۔ قیطلونیہ بلکہ اسپین کے بحر متوسط کے سارے ہی ساحل پر کھدائیوں سے زمانہ گزشتہ کے آثار اور اشیا نکلتی رہتی ہیں جیسے ایبری ظروف، فنیقی قبریں، یونانی رومن سکے، یونان کے سفالی برتن رومہ کے رنگین پچوکے، غوطی سکے، پہاڑیوں کے پہلوؤں پر زیتون و انگور کے باغوں کے ساتھ ایلوا، ناگ پھنی اور بلوط کے جنگل کھڑے ہیں۔ یہاں کے باشندے تنکیل مستعد اور ہر حکومت سے جو برسر اقتدار ہو برابر ناراض پائے جاتے ہیں۔

جنوب میں آبنائے جبل الطارق جسے قدیم یونانی "ہرقل کے ستون" کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ سپین کو شمالی افریقہ سے صرف آٹھ میل کے فاصلے پر لے آتی ہے بلکہ ساحل سے دیکھیے تو افق پر بربر پہاڑ سر اُٹھائے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر آپ لالی نیہ، قادس یا بلنشیہ میں لنگر انداز ہوں تو بالکل دوسری قسم کے سپین میں پہنچ جائیں گے۔ یہ منطقۂ حارّہ کا سپین ہے جہاں گرم افریقی آسمان سے میدانوں میں عجیب چمک دمک آگئی ہے۔ باشندوں کا رنگ سانولا، افریقی حسن کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ بلنشیہ (Valeica) مسلمان موروں اور ان کی آب پاشی کی ہنرمندی کی یاد دلاتا ہے۔ شہر، اس نام کی ولایت میں جہاں واقع ہے وہ کرۂ ارض کے مشہور قطعات باغ میں شمار ہوتا ہے۔ جس کے چاروں طرف کی زمین کو ایک ہزار سال سے پانی دیا جارہا ہے۔ پھلوں، سنتروں کے باغوں، سبزی ترکاری کی باڑیوں، دھان کے کھیتوں کے درمیان سے آپ

سواری میں گزریں تو جگہ جگہ آب پاشی کی نہریں، نالیاں اور پن چکیاں ملیں گی جو غالباً موروں کے زمانے سے کام دے رہی ہیں، ہر جگہ عربی عمارتیں، عربی چہرے نظر آئیں گے۔ عربی الفاظ، عربی راگ کانوں میں گونجیں گے۔

بلنشیہ کے جنوب میں اس سے ملی ہوئی ولایت مرقیہ ہے۔ ان دونوں میں بارش گلیشیہ کی نسبت تقریباً ایک چوتھائی ہوتی ہے۔ چنانچہ مرقیہ والے کہا کرتے ہیں کہ ہمارے صدقے میں سات برس میں ایک دفعہ مینھ برستا ہے مگر برستا اتنا ہے کہ طغیانی آجاتی ہے۔ یہ لوگ بھی مصنوعی ذرائع آب پاشی سے افراط کے ساتھ پھلوں کی کاشت کرتے ہیں۔ یہ منطقہ حارہ سے مشابہ خطہ، کپاس، کیلا، سنترہ، نیشکر، انجیر، زیتون، بادام، انگور وغیرہ پیدا کرتا ہے۔ مرقیہ کا ایک بہت قدیم قصبہ اِلکا (Elche) میں بڑی شاندار کھجوروں کے باغ ہیں۔ یورپ بھر میں صرف یہی جگہ ہے جہاں معقول مقدار میں کھجور پیدا ہوتی ہے۔ یہاں پہاڑی گاؤں الگ تھلگ واقع ہیں اور ان کی عورتیں جو بستی کے کوئیں پر مٹکے بھرنے آتی ہیں ابھی تک چہروں پر اسی طرح نقاب ڈالے ہوتی ہیں، جیسے پانچ سو برس پہلے اُن کی بزرگ مسلمان بی بیاں ڈالے رہتی تھیں۔

سپین کے مشرقی ساحل بحر پر پہاڑ کھڑے ہیں، بعض تو عین سمندر سے اُٹھتے چلے گئے ہیں۔ بعض بے گیاہ، چٹیل ہیں، لیکن ایسے بھی ہیں جن کی ڈھلانوں پر صنوبر، انناس، بلوط اور خرنوب یا خرنوب کے رنگ برنگ کے درخت چھائے ہوئے ہیں۔ خرنوب بحر متوسط کا سدا بہار درخت ہے جس میں سرخ پھولوں کے گچھے خوب چمکتے ہیں۔ اس علاقے کی خمیدہ خلیجوں یا عین ساحل پر بہت سے، عنبری، گلابی، سفید رنگ کے مکانات کی بستیاں سر اُبھارتی ہیں۔ اکثر چھتیں کھپریل کی کوہانی ہوتی ہیں۔ اُن کے درمیان گرجوں کے مینار درخشاں آسمان کے نیچے، پرشوخ گلابی یا نیلے رنگ کی چمک دمک دکھاتے ہیں۔ یہاں کے بہت سے شہر، جیسے جرونہ، اترّاگونہ، ملاغہ، قادس وغیرہ بہت قدیم ہیں،

کہ پچھلے ڈھائی ہزار برس میں کئی کئی دفعہ بنے، بگڑے اور دوبارہ آباد کیے گئے اور کئی حملہ آور قوموں کے قبضے میں آئے اور نکل جاتے رہے۔ تخریب اور تعمیر کا یہ سلسلہ آج تک چل رہا ہے۔ کیونکہ دوسری ولایتوں کی طرح اس علاقے کے شہروں کو سپین کی خانہ جنگی (۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۹ء) میں کبھی ایک فریق نے کبھی دوسرے نے بم باری سے جلایا، برباد کیا اور ابھی تک دوبارہ تعمیر کا کام جاری ہے۔

بلنسیہ اور مرقیہ کی طرح ولایت اندلسیہ بھی نیم جارہ علاقہ ہے۔ دھوپ غضب کی تیز ہوتی ہے۔ مور وضع کے سفید، نیچے نیچے مکانات میں خوش دلی کی شان نکلتی ہے۔ یہ سارا خطہ "سیرا مورینہ" (= کوہ سیاہ) کے بے ڈھنگے پہاڑوں کے جنوب میں پھیلا ہوا ہے۔ پہاڑ کے ان ڈھیروں میں آمد و رفت کے درے معدودے چند ہیں۔ یہ اندلسیہ مسلمانوں کا دل پسند علاقہ تھا۔ اور سب سے زیادہ عرصے تک اُن کے قبضے میں رہا۔ اس کے گرجے مسجدیں بنا لیے گئے جنھیں فتح کر کے بعد پھر عیسائیوں نے گرجا بنا لیا۔ یہ انگور و زیتون کے باغوں کا چند بڑے بڑے نہایت دولت مند جاگیرداروں اور ہزار در ہزار مفلس و مفلوک الحال کسانوں کا علاقہ ہے۔ شہر اشبیلیہ (Sevitte) کے نیچے وادی الکبیر (Guadalquiver) کی نشیبی وادیوں میں لڑائی کے سانڈ پالے جاتے ہیں۔

وادی الکبیر عربی لفظ ہے جس کے معنی بڑی ندی کے ہیں۔ سپین میں صرف یہی ایک دریا چند میل سے زیادہ جہاز رانی کے لائق ہے۔ امریکہ کی دریافت کے بعد سولھویں صدی میں میکسیکو اور پیرو کے خزانے بادبانی جہازوں میں لاد لاد کر سمندر سے اس دریا میں لائے جاتے اور اشبیلیہ کی گودیوں میں اتروا کر "چھٹے گنبد" میں رکھوائے جاتے تھے۔ یہ گنبد دریا کے کنارے "تورِ اورو" یعنی "گنبدِ زر" موسوم تھا۔ وہ ابھی تک موجود ہے مگر اب اس میں صرف جہازوں کے چھوٹے چھوٹے نمونے بنا کے رکھے گئے ہیں۔

"شیری" اندلسیہ کی انگوری شراب کا نام ہے۔ اصل میں یہ "جیرز" کی بگڑی ہوئی صورت

ہے اور جیرزدی فرن ترا" اس شہر کا نام ہے جس میں کھجوریں بوئی جاتی ہیں۔ اور آس پاس کے تاکستانوں میں وہ انگور ہوتا ہے جس سے یہ شراب کشید کرتے ہیں۔ ان میں بہت سے تاکستانوں کے مالک اور سوداگر انگریز ہیں جو سفید دیواروں اور سرخ چھتوں والے وسیع گوداموں میں بڑے بڑے پیپوں میں انگور سڑا کر "شیری" تیار کراتے ہیں۔ سپین کی یہ شراب انگریزوں کو ہمیشہ سے مرغوب ہے۔ یہ بامزہ اور تیز و تند شراب ہے۔ سپین والے اس پر نازاں ہیں۔ اور اس کے انگور کی اچھی بری فصل کو خوب جانتے ہیں۔ سرِشام میدے کی سفید روٹی مکھن کے قیمہ بھرے توس، شیری کے ساتھ (جو ساٹھ ستر برس پرانی ہو) ہسپانیہ کی مخصوص مہمان داری مانی جاتی ہے۔

شہر غرناطہ کا مایۂ ناز الحمرا ہے۔ یہ حسین و جمیل "قصر سرخ" تیرھویں صدی میں مسلمان موروں نے تعمیر کیا اور پندرھویں صدی میں اسے چھوڑتے وقت آنسو بہا کے رخصت ہوئے۔ اس کے کشادہ صحن، چوکوں کی چھت کے ہوادار ایوان و بروج میں آج بھی موروں کی روحوں کے سائے معلوم ہوتے ہیں۔ خود ہمارے امریکی مصنف واشنگٹن اروِنگ کی صدائیں کان میں گونجنے لگتی ہیں۔ جس نے کچھ مدت اس قصر میں بسر کی جو کس مپرسی کی حالت میں پڑا تھا، اور کچھ واقعات اور تخیلات کی مدد سے اپنی کتاب "الحمرا کی کہانیاں" تصنیف کی تھی۔ غرناطہ کے سامنے اسپین کے سب سے جنوبی پہاڑ کوہ نوادا کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ اس کی برف پوش چوٹیاں ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ اس نام کے لفظی معنی ہی برف کا پہاڑ ہیں۔ سپین کی سب سے اونچی چوٹی ل ہاکن انھی پہاڑوں میں ۱۱۴۱۱ فٹ بلند ہے۔

اندلسیہ تو شیری، جپسی، ناچ، قہقہے، سانڈ اور پہاڑوں کا خطّہ ہے اور مرقیہ و بلنشیہ میں آج تک موروں کے اثرات چھائے ہوئے ہیں لیکن سیرا موریہ کے شمال میں چلیے تو سپین کی وسطی سطح مرتفع پر ملک کا آپ کو بالکل نیا مرقع نظر آئے گا۔ پہاڑوں کے پیچ و خم اور سرنگوں سے نکل کر آپ کی ریل لامانکا کے سنسان میدانوں میں پہنچے گی تو آپ یہ دیکھ کر حیران

ہوں گے کہ یہاں درختوں سے زیادہ پَوَن چکیاں بنی ہوئی ہیں جن کا "ڈان کوِک زٹ" کے قصّے میں آپ نے ذکر پڑھا تھا، انھیں دیکھ کر شاید آپ کو یاد آئے کہ سپین یورپ میں دوسرا سب سے بلند ملک ہے۔ اس کے ان وسطی اضلاع میں نہ صرف زمین بلکہ باشندوں کا خمیر بنانے میں بھی پہاڑوں کا حصہ ہے۔ لیونش (Leon) اِکس تری مدورہ، قدیم وجدید قشتالیہ (Castila) کے اضلاع نیز ارغونہ کے چٹیل میدانوں پر آپ پرواز کریں، تو مرتفع میدانوں اور ٹیکروں کا جال سا پھیلا ہوا دیکھیں گے کہ بھورے یا سبزی مائل قطعات کے درمیان الگ الگ اُبھرے ہوتے ہیں۔ انھیں سرخی مائل قطعات سے سنگ سماق و بڑے بڑے بے قرینہ ڈھیر جدا کرتے ہیں اور خود ان پتھروں کے رنگ باداتی، قرمزی یا سیاہ ہیں۔ کہیں کہیں یہ پہاڑیاں دس ہزار فٹ تک بلند ہیں اور ایک علاقے اور برابر والے علاقے کے درمیان فصیل بن کر حائل ہوگئی ہیں۔ اس طرح بیچ کے میدانوں میں جو لوگ بستے ہیں وہ گویا اپنے ہی خول میں الگ تھلگ زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ بڑی جفاکشی کی خشک وسادہ کم خرچ زندگی ہے۔ جس میں پشت ہا پشت سے کوئی فرق نہیں آیا۔ اپنے کنج تنہائی میں لوگ پرانی رسم و روایات اور قدیم طریق معاشرت کے دل دادہ ہیں۔ ترقی کو بدگمانی کی نظر سے دیکھتے اور نئی روشنی کے اکثر خیالات سے بیزار ہیں۔

یہ وسطی سپین اگرچہ زیادہ تر بنجر اور مفلس خطّہ ہے لیکن امیرانہ روایات سے مالا مال رہا ہے۔ قوم کے اکثر فرماں روا اسی سرزمین سے اُٹھے اور قشتالیہ کے حاکموں نے پورے ملک کو اپنی رائے پر چلایا۔ ہر طرف زوال پذیر شہر دیکھ کر یہاں کے شاندار ماضی اور بے مایہ حال کا اندازہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات کسی میدانی قطعے میں ہزار بارہ سو فٹ بلند ٹیکرے پر کوئی شکستہ حال شہر یکایک سامنے آتا ہے تو اس کی عظمتِ رفتہ کی یاد انسان کو بہت متاثر کرتی ہے۔ بعض شہروں کے زبردست بروج اور فصیلیں بجنسہٖ سلامت ہیں، جیسے آولہ کی۔ اور دور سے وہ ایک افسانوی شہر کا پرچھائیں نظر آتا ہے۔ آوِلہ ہی کی مانند

بعض شہروں میں بڑے کلیسا بھی قلعہ بند بنے ہوئے ہیں۔ ان کے کنگروں کے درمیان سوراخ میں پندرھویں صدی کی بھدّی بندوقیں جما کر کلیسا کے پاسبان اور پادری مسلمان محاصرہ کرنے والوں پر آتش باری کیا کرتے تھے۔ دورِ گذشتہ کے بڑے بڑے شہر جیسے برغوس سگوویہ لیونش کے کوچہ و بازار میں گھومیے تو مکانات کی اونچی اونچی بڑے آثار کی دیواریں جو تنگ بازاروں کے کنارے کنارے ملی چلی گئی ہیں اُن کے سایے میں ایسا محسوس ہوگا کہ آپ اسی تاریخی زمانے میں پہنچ گئے۔ آپ حیرت سے "فتح جدید" (Reconquesta) کے سات سو سال یاد کریں گے جس میں سپین والوں نے ایک ایک قلعے اور شہر کے لیے لڑ کر سپین کا چپّہ چپّہ مسلمان فاتحین سے خالی کرایا اور از سرِ نو تمام اہلِ وطن کو ایک سالم قوم بنایا۔

باب دوم

ماضی کی پرچھائیں

سپین کے قدیم راستے طے کیجیے تو کہیں گرمیوں کے بھورے گرد و غبار سے گزرنا ہوگا اور کہیں سرد برفانی ہواؤں سے کہیں وسیع میدانوں کے کناروں پر سنہری، سرخ یا سیاہ کوہستانی سلسلے محیط ہوں گے اور آپ کو اُن سیاحوں پر حیرت ہوگی جو ایسی گرمی یا شدید سردی کے علاقوں سے گزر کر پہاڑی بلندیوں تک پہنچے۔ پھر یکایک آپ کو عہدِ عتیق کے ہزاروں بھوت ہر طرف سے آگھیریں گے۔ سب سے پرانے تو وہ جن کے خال وخط ندارد ہیں۔ کیونکہ جزیرہ نما کے ان ابتدائی باشندوں کا کچھ حال معلوم نہیں۔ پندرہ بیس ہزار سال میں ان کے بہت کم اثر آثار باقی بچے۔ کہیں کہیں پتھروں کے بڑے بڑے گھیر (جو غالباً مردے دفن کرنے کے خانے تھے)۔ ابھی موجود ہیں۔ بعض غاروں میں ماقبل تاریخ زمانے کے نقوش بھی ملے ہیں۔ ان میں شمالی سپین کے آلِ تمیرہ کے غار سب سے اچھی حالت میں سلامت رہے۔ ان کا داخلہ ہزاروں برس تک بڑی بڑی چٹانوں سے چھپا رہا۔ یہی سبب تھا کہ پچھلی صدی کے اواخر میں ان کا پتا چلا تو پرانے نقاشوں کی تصویروں کے رنگ تک نہیں اُڑے تھے۔ بلکہ یہ سرخ وسیاہ یا ہلکے سبز رنگ جنھیں پتھر کے کوئلے، لکڑی کی چھال اور لوہے میں چکنائی ڈال کر بنایا گیا تھا، آج تک محفوظ رہے۔ تصویریں غار کی چھت اور دیواروں پر جنگلی بھینسوں، گھوڑوں، سوروں اور ہرنوں کی بنائی گئی ہیں کہ قدم بڑھائے دوڑ رہے ہیں اور ان میں اصلی حالت سے نہایت مشابہت پائی جاتی ہے۔

ان ماقبل تاریخ نقاشوں کے بعد اِبیری (Iberian) قوم کا زمانہ آتا ہے جن کے نام سے یہ پورا جزیرہ نما، بشمول پرتگال، اِبیریہ موسوم ہوا۔ ان کی نسبت کچھ زیادہ معلوم ہے۔ یہ لوگ غالباً شمالی افریقہ کے خانہ بدوش تھے۔ جو خشکی کی ایک پٹی سے اُتر کر سپین میں گئے۔ یہ پٹی وہاں تھی جہاں اب آبنائے جبل الطارق نے سپین کو افریقہ سے جدا کر دیا ہے۔ شاید ۲۵۰۰ قبل مسیح میں اِبیری قوم سپین کے بحر متوسط پر کوہستان پائی رین تک آباد ہوئی۔ بعض تحریروں اور پرانے ظروف کی تصویروں میں انھیں سانولے رنگ، چھوٹے قد، گٹھے ہوئے بدن کے آدمی دکھایا گیا ہے۔ جن کے چہرے لمبے، بڑی ناک اور ٹھوڑی کچھ اندر کو دھنسی ہوئی ہوتی تھی۔ ظروف کے اوپر بہت سے مناظر میں وہ جنگلی جانوروں کا شکار کرتے دکھائے گئے ہیں۔ بعض تصویروں میں وہ پیادہ یا گھوڑوں پر یا کشتیوں کے عرشوں پر کھڑے آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگجو، اچھے سپاہی، بڑے شکاری اور آزادی پسند لوگ تھے۔

۶۰۰ ق م کے قریب ایک اور قوم فرانس کی طرف سے کھسکتے کھسکتے سپین میں آئی تاآنکہ کوہستان مورینہ (= سیاہ) نے اسے جنوب میں بڑھنے سے باز رکھا۔ یہ سِلت، یا قلط (Celt) موسوم ہے۔ یہ گلہ بانی کرتے تھے۔ تہذیبی ذوق نہ تھا۔ چنانچہ صدیوں تک رہے مگر نہ شہر بنائے نہ اور کوئی تحریری یادگار چھوڑی، البتہ دوسرے ذرائع سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ قوی الجثہ تخنتی لوگ تھے۔ ناک ستواں، رنگ گورا اور بال عموماً بھورے یا سرخ ہوتے تھے۔ گلیشیہ میں اُن کی نسل کے لوگ آج بھی یہ خصوصیات رکھتے ہیں۔ ان نسلی خصوصیات کے سوا، سِلت قوم نے سپین میں کوئی ترکہ چھوڑا تو وہ چند لفظ یا ایسی سیدھی سادی چیزوں کے، جیسے ہنڈیا، ساگ، چربی، کے نام ہیں جو غریبوں کی طرح سپین کی زبان میں دبے پاؤں چلے آئے ہیں۔

سِلت اور اِبیری کئی صدیوں تک پہلو بہ پہلو آباد رہے۔ اکثر لڑائیاں ہوتی تھیں

پہاڑکے دروں سے نکل کر اچانک چھاپے مارے جاتے تھے۔ کبھی کبھی صلح بھی ہو جاتی تھی۔ پھر آپس میں شادی بیاہ ہونے لگے یہاں تک کہ رفتہ رفتہ یہ خاصی طرح گھل مل گئے اور ایک نئی مخلوط قوم بن گئے جسے ہم "سیلٹیبیری" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہی مخلوط نسل پورے جزیرہ نما میں پھیلی اور اسی خاندان کی اولاد موجودہ ہسپانوی قوم ہے۔ مرورِ زمانے سے دوسری قومیں بھی ادھر آئیں۔ ان میں سب سے پہلے فنیقی اور ایشیائے کوچک کے یونانی تھے جو بحری تجارت کا پیشہ کرتے تھے۔ اور کمزور سی کشتیوں میں اپنے وطن سے بحر متوسط (یا بحر روم) کی آبی شاہراہوں کو طے کرتے ہوئے اکثر ساحلی مقامات پر پہنچتے اور پائدار تجارتی روابط قائم کرتے تھے۔ یہ دوسرے مقامات کی طرح سپین میں بھی آئے مگر مستقل طور پر نہیں آباد ہوئے۔ ان کا مقصد صرف نفع کمانا تھا اور یہ سپین کی کانوں سے چاندی سونا، جست اور تانبہ نکال کر لے جاتے تھے۔ تاہم ان دونوں قوموں نے اسپین میں اپنے نقش چھوڑے۔ فنیقیہ کا نقش اتنا گہرا نہیں ہوا، پھر بھی ان کے اثرات باقی ہیں اور اہل سپین میں فنیقی خون کی تھوڑی سی آمیزش پائی جاتی ہے۔

سپین کے ناچ کی تال میں فنیقی رنگ جھلکتا ہے۔ پھر بھی ایشیائی لوگ دھات کے نفیس کام کا ہنر اپنے ساتھ لائے تھے جسے اِبیریہ والوں نے اُن سے سیکھا۔ کبھی کبھی وہ سونے کی کوئی بھاری مالا یہاں چھوڑ گئے جس کے سرے پر کہربا یا سانپ کا پھن بنا ہوتا تھا اور یہ صدیوں بعد کسی شکستہ دیوار کی نیو یا قبر کے اندر سے کھد کر نکل آئی۔ پھر قادس اور ملاغہ کی بنا بھی انھی فنیقیہ والوں نے رکھی تھی لیکن چند ہی نسل کے بعد وہ سپین کا سونا لاد کر اور سپین کی چاندی سے اپنے جہازوں کے لنگر بنا کر یہاں سے چلے گئے اور پھر ان ساحلوں پر کبھی نہ آئے۔

اُن کی نسبت یونانیوں نے اپنی زیادہ یادگاریں چھوڑیں۔ "مغربِ اقصیٰ کی مالا مال سرزمین" کے قدیم افسانے جو دنیا اور خود اسپین والوں کے کان میں پڑے، وہ انھی یونانیوں

کی ابتدائی تحریروں کی یادگار تھے۔ سپین اور افریقہ کو ملانے والی خشکی کی پٹی اُس وقت زیرِ آب آچکی تھی۔ یونانی جہازی اس کے پار تک نکل جاتے تھے اور اس آبنائے کو انہوں نے اپنے افسانوی سورما ہرقلیس ہی سے موسوم کردیا تھا۔ جسے اب ہم جبل الطارق پکارتے ہیں۔ اس کے آگے متلاطم اور بے کنار سمندر تک پہنچ کر جب وہ واپس وطن جاکر یہاں کے عجائبات کے قصے سناتے تو اُن کے شاعروں کی قوتِ متخیلہ کو تحریک ہوتی اور وہ اس عظیم سمندر اور اُس کے ساحلوں کی نظم میں خیالی تصویریں کھینچتے تھے۔ یونانی جہازیوں نے اپنے سامعین کو ایک عجیب وغریب فصیل والے شہر "ترتِسوس" کا حال بھی سنایا تھا۔ جس کے قریب چاندی کی تہ کی ندی بہتی تھی اور وہاں کے دولت مند اور مہربان باشندے یونانی شراب، خود اور ظروفِ گِلی کے عوض اپنے ہاں کی قیمتی دھاتیں فروخت کرتے تھے۔

یونانی صناعی کی باقیات سپین میں ملی ہیں۔ خوبصورت گل دان اور چھوٹی چھوٹی مورتیاں جو ابیری معابد سے کھدائی میں نکلیں یونانی اثرات کی شہادت دیتی ہیں۔ اسی طرح کبھی کبھی وہ ابیری بت برآمد ہوئے جو یونانی اثرات کے تحت مقامی بُت تراشوں نے بنائے تھے۔ ان میں سب سے حسین مورت ساحل بحرمتوسط کے کھجوروں والے شہر اِلکہ میں نکلی۔ یہ کسی نوجوان عورت کا جسے ابیری برہمن خیال کیا جاتا ہے، نیم قامت مجسمہ ہے۔ اس میں کئی قوموں کے جو سپین میں داخل ہوئیں، ذوق کا پتا چلتا ہے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ اس کے سر کی بھاری بربری پوشش ابیری، بھدّا زیور فنیقی وضع کا ہے، لیکن خود مورت کی تراش یونان کے قومی اثرات کا ثبوت ہے۔ اس کا نام "خاتونِ الکہ" ہوگیا ہے۔ آپ پریڈو میوزیم، میڈرڈ میں اس کی زیارت کرسکتے ہیں۔ ورنہ سپین کے ایک پسیتہ (سکّہ) کے نوٹ پر بھی اس کی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔

یونانیوں اور فنیقیوں کے بعد قرطاجنہ والے آئے اور یہاں رہ پڑے۔ یہ

شمالی افریقہ کے اسی نسلی خاندان سے تھے جن سے ایبیری تھے اور شاید اسی سبب سے ان کی فتوحات عموماً بغیر کشت وخون کے ہوئیں تاہم ترتیسوس والوں سے ضرور ان کی جنگ ہوئی ہوگی۔ کیونکہ وہ قرطاجنہ کے دشمن، یونانیوں کے دوست تھے۔ بہر حال سبب جو کچھ ہو، ترتیسوس شہر کو ان حملہ آوروں نے ایسا برباد کیا کہ اس کا نام ونشان کچھ باقی نہیں رہا۔ مزید برآں قرطاجنہ کے تسلط کے بعد سپین کے جنوبی سواحل پر یونانیوں کے آنے کی ممانعت کر دی گئی۔ پھر قرطاجنہ والوں نے یہاں کی کانیں کھودیں اور ان کی دولت لاد لاد کر وطن لے گئے۔ صوبہ مرقیہ میں ان کانوں کے نشانات ابھی تک موجود ہیں مگر سونے چاندی سے بھی زیادہ قیمتی چیز جو قرطاجنی فاتحین کے ہاتھ آئی، وہ سپین کی آبادی، یعنی سپاہیوں کا ذخیرہ تھا۔ یہاں کے "سلتیبیری" قبائل جنگ کے لیے، جو اُن کا سب سے دل پسند پیشہ تھا، اپنی خدمات خوشی سے بیچنے کے لیے تیار تھے۔ لوٹ مار اور چھاپے مارنا ان جنگجو، تند خو لوگوں کو بہت مرغوب تھے۔ قرطاجنہ کی کشورکشائیوں میں دور دور تک دل کے حوصلے نکالنے کا موقع ملتا تھا۔ قرطاجنہ کا نامور سپہ سالار ہنی بال ۲۱۶ ق م میں سپین وفرانس کے راستے کوہستان ایلپس کے پار ہوا اور شہر رومہ پر حملہ کرنے کے لیے اطالیہ میں در آیا، تو اس کے لشکر عظیم کی قوتِ بازو اندلسیہ کے سلتیبیری پیادہ وسوار تھے۔

ایبیری اور قرطاجنی خوش دلی سے ساتھ ساتھ رہے۔ باہمی ازدواج سے شیروشکر ہوگئے اور ہم چاہیں تو اُس مخلوط قوم کے لیے جو رومنوں کے حملے کے وقت سپین میں آباد تھی "قرطاسلتبیری" کی علمی اصطلاح تراش سکتے ہیں۔ رومنوں کا جزیرہ نما ایبیریہ پر حملہ ہنی بال کی ناکام اطالوی لشکرکشی کے دس برس بعد ہوا۔ اور انھوں نے قرطاجنی فوجوں کو ۲۰۵ ق م میں سپین سے نکال دیا۔ مقامی باشندوں کو اس کا بہت صدمہ ہوا۔ اور انھوں نے اہلِ رومہ کی حکومت سے بغاوت کی۔ بغاوتوں کا سلسلہ جاری رہا اور وہ اتنی پیہم اور شدید تھیں کہ رومن سپاہی تک سپین بھیجے جانے سے ڈرنے لگے تھے۔ ایک دفعہ

رومہ کے پورے ایک لشکر (لیجین) نے یہ سن کر کہ وہ سپین بھیجا جا رہا ہے حکم ماننے سے انکار کر دیا اور لڑنے پر تیار ہو گیا

سپین والوں کی مزاحمت ڈیڑھ سو برس چلتی رہی اور کہیں پہلی صدی قبل مسیح میں فرو ہوئی جب کہ اندرونی اضلاع کے جنگلی قبیلے رومہ کے مطیع ہو گئے۔ آخر کار پورا ملک رومن قانون کا پابند اور سلطنتِ رومہ کا وفادار صوبہ بن گیا۔ بلکہ آگے چل کر اطالیہ کے سوا اور سب ولایات سے زیادہ رومہ کا اثر اُسی نے قبول کیا۔ اہلِ رومہ نے اسپین کی تاریخ کا رُخ بدل دیا۔ پہلے وہ اُسے افریقہ کے نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے لیکن اب اسے یورپ کے سیاسی نظام کا جزو بنا لیا۔ پھر اُنھوں نے اس جزیرہ نما میں کثرت سے شہر بنائے اور ان کے طویل قیام کی بہت سی نشانیاں ابھی تک موجود ہیں۔ رومن شہر و قصبات کی تعداد آٹھ سو سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ جن میں صاف ستھرے بازار اور خوشنما مکانات بنے ہوئے تھے۔ گرم کرنے کا اور گندہ پانی نکالنے کا بلدی انتظام تھا۔ حفاظت کے لیے مضبوط فصیلیں بنی ہوئی تھیں۔ مشرقی ساحل پر رومن دارالحکومت تراکو (تراگونہ) کے گرد و پیش چالیس میل کی بڑے آثار کی فصیل تھی۔ سارے ملک میں بہت اچھی شاہراہوں کا جال سا بچھا دیا تھا۔ کئی مقامات پر ان کے ندیوں پر بنائے ہوئے پل آج تک برابر کام دے رہے ہیں۔ اشبیلیہ کے قریب ایک قدیم رومن شہر اطالکہ کی کھدائی میں مکانات کے اندر اعلیٰ درجے کے چارخانے کے فرش برآمد ہوئے۔ سرحد پرتگال کے قریب شہر ماردہ کی کھدائیوں میں ایک رومن تماشا گاہ کی عمارت نکلی جس میں پانچ ہزار نشستیں بنی ہوئی تھیں۔ اسی طرح ایک اور وسیع دنگل کے آثار برآمد ہوئے اور اسی عہد کی پختہ نہر کے کھنڈر بھی پائے گئے۔ میڈرڈ سے ساٹھ میل شمال مشرق میں شہر سگوبیہ کا پختہ تالاب اور نہر سپین میں اہل رومہ کی سب سے عظیم یادگار ہے۔ اس تعمیر میں ۱۲۸ پرشکوہ محرابیں سنگِ سماق کی بنائی ہیں۔ جن کے ذریعے دس میل دور کے پہاڑوں سے آج اٹھارہ سو برس بعد

تک شہر میں پانی آتا ہے۔

رومہ نے اسپین کو تین زبانیں عطا کیں: قیطلونی، پرتگیزی اور سپینی۔ یہ تینوں مقامی بولیاں لاطینی بول چال کے اثر سے بنی تھیں لیکن چند صدی کی تراش خراش اور توسیع سے باقاعدہ الگ الگ زبانیں بن گئیں۔ قیطلونی، ماضی میں بہت ممتاز اور حبِّ وطن پر لوگوں کو اُبھارنے والی زبان تھی لیکن اب فقط تبرک رہ گئی ہے۔ پرتگیزی پرتگال میں تو بولی ہی جاتی ہے لیکن سپین میں شمال مشرقی صوبۂ گلیشیہ کی صرف مقامی بولی کے طور پر سلامت ہے۔ البتہ قشتالیہ کی زبان اب اسپینی کے نام سے قومی زبان ہے۔ توازن اور حسن کے ساتھ صدہا عربی الفاظ نے اسے پُرمایہ بنا دیا ہے۔

رومن ثقافت کے عطیے کا سپین کی طرف سے طرح طرح سے معاوضہ ادا کیا گیا۔ وہاں کے معادن کی دولت سے رومہ نے فائدہ اُٹھایا۔ بحرِ متوسط کے سرے پر اس کا محل وقوع پھر یہاں کے سپاہیوں کی بہادری سلطنتِ رومہ کے کام آئی۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ سپین زاد اہلِ قلم نے لاطینی نظم، تاریخ اور فلسفے میں کئی شاہکار تیار کیے اور رومہ کی ادبی اور سیاسی عظمت کو چار چاند لگائے۔ سپینی نژاد کے سات افراد سلطنت رومہ کے تخت پر متمکن ہوئے۔

سپین کی قسمت لازماً رومہ سے وابستہ ہو گئی تھی، لہٰذا پانچویں صدی میں جرمن اقوام نے رومہ کو پامال کرنا شروع کیا تو سپین بھی ان کی زد میں آ گیا۔ سپین کی فوجیں زوال پذیر سلطنت کے دوسرے صوبوں کی حفاظت کے لیے، برطانیہ، شمالی افریقہ اور اطالیہ میں تعینات تھیں، خود سپین کے علاقے بچانے والا کوئی نہ تھا، قُرطبہ، اشبیلیہ، تراگونہ جیسے بڑے بڑے شہروں نے جن کی آب و تاب سوائے رومہ کے اطالیہ کے دوسرے شہروں سے بھی بڑھی چڑھی تھی، بلا مزاحمت حملہ آوروں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور اب ان وحشی جرمنوں کی آمد سے سپین کی رومن روشوں اور بازاروں

یں ہر طرف وہی لمبے لمبے بھورے رنگ کے قبائلی گھومتے پھرتے نظر آنے لگے۔ رفتہ رفتہ وہ سارے ملک میں پھیل گئے اور ان کی ایک قوم وِس گاتھ (یعنی غوطی) سپین کی مالک بن بیٹھی۔ اوّل اوّل تو ان وحشیوں نے قتل عام کیے، لوٹا، تباہ کیا، بربادی اور وبائیں پھیلائیں لیکن آگے چل کر محکوم قوم کی تہذیب و نفاست سے مغلوب ہو گئے۔ اور پھر ان کی ایک کمزور مرنجاں مرنج سی حکومت قائم ہو گئی۔ سپین کے باشندوں میں جو پہلے ہی سِلٹ، ایبیریہ، قرطاجنہ کی مخلوط نسل سے تھے، اب وِس گاتھ قوم سے شادی بیاہ ہونے لگے۔ پھر یہ حملہ آور اور محکوم رعایا یکساں آئین و ضوابط کے پابند ہو گئے۔ گرجوں میں مل کر عبادت کرنے لگے اور سب نے پاپائے روم کو اپنا مذہبی امام تسلیم کر لیا۔ یہ لاطینی بولتے تھے جو رفتہ رفتہ سپینی ہوتی جاتی تھی۔

اس شیرازہ بندی کے باوجود غوطی بادشاہوں میں اچھی حکومت کرنے کی صلاحیت نہ تھی۔ وہ اپنے خاندانی جھگڑے ہی طے نہ کر سکتے تھے۔ اسی نااہلی کے باعث رعایا اتنی مفلوک الحال اور بد دل تھی اور حکمراں خاندان کے افراد ایک دوسرے کے ایسے دشمن تھے کہ مسلمان حملہ آوروں کا سیلاب آیا تو سپین بے بس رہ گیا۔ اگرچہ دینِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے آغاز کو سو برس بھی نہ ہوئے تھے، تاہم اس کے نام لیوا ملک عرب سے نکل کر فلسطین و شام، مصر و شمالی افریقہ پر دیکھتے دیکھتے مسلط ہو گئے اور فتح کے ساتھ اپنا دین پھیلاتے جاتے تھے۔ شمالی افریقہ سے اُنھوں نے سمندر پار سپین پر نظریں ڈالیں۔ ۷۱۱ء میں جب وہ اس پر جھپٹا مارنے کی سوچ رہے تھے۔ یہاں کا غوطی بادشاہ رَوڈرِک تھا۔ اس نے پہلے بادشاہ وِتیزا کو دھکیل کر تخت پر قبضہ کیا اور وِتیزا کے بیٹوں کو ملک بدر کر دیا تھا۔ وہ شمالی افریقہ کو بھاگ آئے اور رَوڈرِک کے مقابلے کے لیے مددگار ڈھونڈ رہے تھے۔ اس بادشاہ نے شمالی افریقہ کی بندرگاہ سبطہ کے حاکم کاونٹ جولیَن کو بھی اپنا دشمن بنا لیا تھا، سبطہ

سپین کے سامنے آبنائے کے دوسری طرف واقع ہے۔ جولین شاہ رَوڈرِک کے خلاف اور وِتیزا کے بیٹوں کے ساتھ شریک سازش ہوگیا اور سبطہ کو مسلمانوں کے حوالے کردیا جنھوں نے سپین پر لشکرکشی کے لیے اسی شہر کو اپنے اقدام کی منزل قرار دیا۔ اسلامی مجاہدین کی پہلی جمعیت کا سپہ سالار یک چشم طارق ابن زیاد تھا جو سپین کی جنوبی پھننگ کی حفاظت کرنے والی زبردست پہاڑی پر آترا اور وہاں کی پاسبان غوطی فوج کو شکست دی۔ پھر اس پہاڑی کو خود اپنے نام پر جبل الطارق یعنی طارق کی پہاڑی موسوم کیا۔

اگرچہ رَوڈرِک حملہ آوروں سے لڑنے کے لیے اسّی ہزار کا لشکر لایا تھا مگر اس کے اکثر سپاہی غلام اور پیادہ پا تھے، جو صرف تیر کمان اور فلاخن (گوپھن) سے مسلح تھے۔ طارق کی فوج میں ۱۲ ہزار جوان مگر تقریباً سب اچھے ہتھیاروں سے مسلح سوار تھے۔ لڑائی مسلسل ایک ہفتہ ہوئی اور شاہ اسپین کی فوجیں برابر پیچھے ہٹتی رہیں یہاں تک کہ جنوبی سپین کی چھوٹی ندی گوادَلیت[1] پر جو چند میل آگے جاکے بحراوقیانوس میں گرتی ہے، انھیں شکست ہوئی۔ یہ صحیح معلوم نہیں کہ خود رَوڈرِک کا حشر کیا ہوا۔ سپین کے پرانے گیتوں میں آتا ہے کہ وہ صرف زمرد جڑی سونے کی کھڑاویں ندی کے کنارے چھوڑ کر میدان جنگ سے غائب ہوا اور دوبارہ مسلمانوں سے ایک لڑائی لڑنے نمودار ہوا، لیکن مسلمان مؤرخ کہتے ہیں کہ وہ مارا گیا اور اس کا سر کافور میں محفوظ کرکے نشان فتح کے طور پر مکّے بھیجا گیا۔

رَوڈرِک کے خلاف، جولین کو وِتیزا کے بیٹوں کے علاوہ اور حلیف بھی مل گئے تھے۔ کیونکہ سپین کے یہودی بھی غوطی بادشاہوں کی مذہبی تعدّی سے نجات پانے

---

[1] ندی کا نام اور بعض دوسری جزئیات مصنف نے پوری صحت سے نہیں لکھیں لیکن غیراہم ہونے کی وجہ سے بجنسہ ترجمہ کردیا گیا ہے۔ مفصل حالات سپین کی اردو مترجمہ تواریخ نیز حتی کی تاریخ عرب میں تحریر ہیں۔ دیکھیے حواشی ضمیمہ باب ۲
مترجم

کی امید میں رَوڈرِک کے خلاف شریک سازش ہوگئے تھے۔ یہ یہودی کم سے کم چودہ صدیوں سے سپین میں بسے ہوئے تھے۔ ان کی روایتوں میں آتا ہے کہ وہ سپین میں (جسے وہ "سِفردہ" موسوم کرتے تھے) ماقبل تاریخ زمانے میں آئے۔ ان دعاوی کا ثبوت نہیں ملتا تاہم خیال کیا جاتا ہے کہ تھوڑے سے یہودی فنیقیہ والوں کے ساتھ چھٹی ساتویں صدی قبل مسیح میں یہاں آئے۔ ساحل کے تجارتی شہروں میں ان کی بارونق آبادیاں ہونے کا ہمیں علم ہے۔ اہل رومہ یہودیوں پر مہربان تھے اور ان کے زمانے میں یہودیوں کو دولت کمانے مال و منال، غلام، گھوڑے، تاکستان، زیتون کے باغ ملکیت میں رکھنے اور صاحب رسوخ و اثر ہوجانے کی آزادی تھی۔ وِس گاتھ بادشاہوں کی حکومت میں یہ خوش حالی اور تحفظ غائب ہوگیا۔ ساتویں صدی میں اسی خاندان کے ایک بادشاہ نے حکم دیا کہ تمام یہودی عیسائی بنالیے جائیں، خوشی سے نہ ہوں تو جبراً بنائے جائیں۔ چنانچہ یہودیوں نے مزاحمت کی تو اُن پر بڑے ظلم توڑے گئے۔ اس لیے حیرت کی بات نہیں کہ آٹھویں صدی میں مسلمانوں کی لشکرکشی کے وقت یہودی بڑے شوق سے غوطی بادشاہوں کے دشمنوں کے ساتھ مل گئے۔ انھیں طارق اور اُس کی قبائلی فوج کا آنا ایسا معلوم ہوا، جیسے آسمان سے انھیں غلامی کے عذاب سے چھڑانے کو خدانے فرشتے بھیج دیے۔

باب سوم

مسلمان، مور

۷۱۱ء تا ۷۱۸ء میں مسلمان سارے جزیرہ نما میں پھیل گئے۔ شمال کی ایک پٹی کے سوا، جہاں تھوڑے سے سپینی شکست سے بچ کر پہاڑ کی گھاٹیوں اور غاروں میں چھپ رہے تھے، سارا ملک مسلمانوں نے فتح کر لیا۔ کامیابی کا سب سے اچھا ثمر طارق اور اُس کی فوج کے نصیبب میں نہ آیا کیونکہ شمالی افریقہ کا امیر موسیٰ ابن نصیر (جس کا طارق پہلے غلام تھا) اپنے نائب کے تھوڑے ہی دن بعد خود سپین آگیا اس نے طارق اور اس کی فوجوں کو تو وسط ملک اور شمال کے بنجر میدانوں، پہاڑوں اور جنگی سرحدوں کی طرف چلتا کر دیا اور جنوبی سپین خاص اپنے تخت میں رکھا۔ یہ خطہ آخر تک مسلمانوں کو مرغوب رہا۔ موسیٰ کے الفاظ میں "وہ زمین و آسمان میں ملکِ شام، آب و ہوا میں یمن، گل و ریاحین میں ہندوستان، پھلوں میں مصر اور سونے چاندی میں چین کے مماثل" تھا۔

لفظ "مور" عمومی معنی میں سپین کے سبھی مسلمانوں کے لیے بولا جاتا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ صحیح معنی میں "مور" مغرب کا مسلمان یا شمالی افریقہ کا بربر ہے۔ لیکن مسلم فاتحین کی صفوں میں مشرق کے یمنی، شامی اور دوسرے عرب سبھی شامل تھے جنھیں سارا سین (SARACENS) شرقیین کی بگڑی ہوئی صورت) کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے طارق مُور تھا اور موسیٰ سارا سین۔ یہ گروہ ایک دوسرے کے حریف اور بعض اوقات سخت دشمن ہو جاتے تھے۔ مور و سارا سین کی اسی تفریق کی وجہ تھی کہ سپین کے مسلمان حملہ آوروں نے اپنی

جنگی کامیابیوں سے یہ سارا ملک تو فتح کر لیا لیکن وہ اسے پائدار متحد حکومت بنانے میں اور امن و امان کے ساتھ مل کر رہنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ مور و سارا سین کی باہمی عداوت کے علاوہ ان میں سے ہر فریق کے اندر بھی پرانے قبائلی جھگڑے، خون کے انتقام کے مطالبے اور گروہ بندیاں چلی آتی تھیں۔ دونوں فریق کے لوگ بہت اکھڑ، آزادی پسند تھے اور مقامی رئیس یا برادری کے بزرگ کے سوا کسی کی وفاداری نہ کرتے تھے۔ اسی سے مسلم سپین شاید ہی کبھی مضبوط وحدت بنا ورنہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا ایک کمزور زنجیرہ ہی رہا کہ معمولی جھٹکے سے اس کی کڑیاں الگ ہو جاتی تھیں۔ سپین اور اس کی رسم و روایات کے حق میں بہتر ہوا کہ حسنِ اتفاق سے شروع میں اقتدار کا پلڑا شاعر مزاج سارا سین (یا عربوں) کی طرف جھکا رہا اور جنگجو موروں کی بجائے کئی صدیوں تک وہی غالب رہے۔ یہ عرب حسن کے دل دادہ، علوم کے پرستار اور دوسرے مذاہب سے رواداری کرنے والے لوگ تھے۔ اُنھوں نے سپین کو اعلیٰ تہذیب و ثقافت کا نمونہ بنا دیا۔ رفتہ رفتہ نیم وحشی بربر بھی ان کی شائستہ، شریفانہ زندگی کی خوبیاں جان گئے اور عربوں کی طرح مساجد و محلات بنانے، کتاب خانے فراہم کرنے اور عیش و عشرت کے نفیس اسباب جمع کرنے میں اُن سے بازی لے جانے لگے۔

سپین کے عرب فرماں رواؤں کی فہرست اُلجھی ہوئی ہے مگر ان کے چند روشن ناموں میں ایک عبدالرحمٰن اول تھا جسے ہم اہلِ مغرب (Abderrman) موسوم کرتے ہیں۔ اس دانش مند بادشاہ نے ملک میں نئی نئی صنعتیں جاری کیں اور انھیں فروغ دیا، جیسے ریشم بافی، کاغذ سازی، فولاد پر سونے چاندی کی ترصیع یا جڑت کا باریک کام جسے دمشقی صنعت کہتے تھے اور اب تک سپین میں رائج ہے۔ نیز اعلیٰ درجے کی چرمی مصنوعات جو قرطبہ کے نام پر قرطبی کہلاتی تھیں۔ عبدالرحمٰن نے

اندلسیہ میں کیلے، گنے، کپاس اور کھجور کی کاشت کا آغاز کرایا اور کہا جاتا ہے کہ کھجور کا پیڑ جو اس کے باغ میں لگایا گیا سپین میں سب سے پہلی کھجور تھی۔ یہ بادشاہ باغبانی کو فنون لطیفہ میں شامل سمجھتا تھا اور اس کے ذاتی باغ، پھولوں، سایہ دار درختوں اور حوضوں کا نادر روزگار مجموعہ تھے۔ عمارت سازی میں بھی اُسے بڑا امتیاز حاصل ہوا۔ اُس نے قدیم رومن سڑکوں اور نہروں کی مرمت کرائی، نئے نئے محلات اور مسجدیں تعمیر کیں، جن کی دیواریں بھاری بھرکم اور پتلے پتلے نفیس مینار اندلسیہ کی تابناک فضا میں سر اٹھائے ہوئے کھڑے تھے۔ ۷۸۶ء (۱۷۰ھ) میں اپنی وفات سے کچھ پہلے اس نے شہرۂ آفاق جامع قرطبہ تعمیر کی۔ اس عمارت کا نقشہ خود بنایا اور اس کی چنائی میں کم سے کم ایک گھنٹہ خود کاریگروں کے ساتھ مرتے دم تک مشقت میں شریک رہتا تھا۔ یہ مسجد ابھی تک قائم ہے۔ اگرچہ اس کے اندر عیسائی گرجا بنا لیا گیا۔ تاہم اصلی عمارت کے اتنے اجزا ہنوز باقی ہیں کہ انھیں دیکھ کر آدمی مشرق کے ذوقِ جمال پر دنگ رہ جاتا ہے۔ آٹھ سو سے زیادہ ستون سنگ مرمر اور سنگ سلیمان، سنگ سرخ و سماق اور یشب کے (بلکہ ایک کبریت یعنی گندھک کی بو والا بھی) وسیع صحنوں کے کنارے کنارے چلے گئے ہیں، جن کی بلند محرابوں میں چاندی، پیتل اور تانبے کے جھاڑ فانوس آویزاں کیے جاتے تھے۔ یہ ستون سپین کے مختلف اقطاع اور جنوبی فرانس کی رومن عمارات سے مسلمان فاتحین لاد لاد کر قرطبہ میں لائے تھے۔ اس عظیم الشان مسجد کے بائیں باغ کی رسیلی ہوا سنتروں کی خوشبو سے مہکتی ہے۔ اس کی سیر کیجیے تو مسلم سپین کا وہ درخشاں دور آسانی سے آپ کے تصوّر میں پھرنے لگے گا۔ جب کہ یہاں کے امرار وہ نفیس محلات تعمیر کر رہے تھے جن کی بیرونی دیواریں بہت چوڑے آثار کی اور لمبی لمبی ڈیوڑھیاں نعل نما محرابوں کی ہوتی تھیں۔ اندر کے وسیع ایوانوں میں چوکے کا فرش اور نفیس نقش و نگار کی جالیاں ان میں دیوار کا کام دیتی تھیں۔ صحن تک میں سنگ مرمر کے فرش اور

پھولوں کے باغ وبستاں میں بہتے پانی کی نہریں بنی ہوتی تھیں۔ یہاں رقص و سرود کی محفلیں جمتیں، شعر گوئی اور شعر خوانی کی جاتی، فلسفۂ یونان پر بحث مباحثے ہوتے۔ ستاروں کا جتنا کچھ علم تھا، اسی کی بنیاد پر نجومی احکام لگائے جاتے۔ کیمیا کے نسخوں اور سنگ پارس کی جستجو ہوتی جس کی نسبت لوگوں کو یقین تھا کہ ہر دھات کو سونا بنا دیتا ہے اُنھوں نے ایسے ایسے کتب خانے فراہم کیے کہ یورپ والے دیکھ کر حیرت اور حسد کرتے تھے۔ صرف اندلسیہ اور برابر کی ولایت مرقیہ ہی میں ستر کتب خانے مختلف مقامات پر تھے، اور صرف ایک بڑے خاندان میں پانچ لاکھ کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ یہاں کے اہل علم کیمیا سے مہوسی اور ہیات سے جوتش کا فضول کام لے کر انھیں خراب کرتے تھے لیکن ان کی علمی تحقیقات صرف انھی فضولیات میں محدود نہ تھی۔ آب پاشی، پیوند کاری اسپ و مویشی پروری جیسے مفید موضوعات پر اُنھوں نے بہت سی بیش بہا کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ جنوبی اور مشرقی سپین میں پھلوں کے صدہا باغ، باڑیاں اور ان میں آب پاشی کے ذرائع ایک ہزار برس گزرنے کے بعد آج کی یاد کو سرسبز رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ بہت سے انگریزی لفظ (مثلاً Algebra, alcohol) (Zenith Nadia وغیرہ) جو زبانوں پر ہنوز جاری ہیں اعتراف کرتے ہیں کہ ہم عربوں کے زیر بار ہیں۔

سپین والے تو بہت سی باتیں ابھی تک کرتے، اور کہتے ہیں اور جانتے بھی نہیں کہ وہ موروں کی تقلید کر رہے ہیں مثلاً آپ کسی ہسپانوی کے گھر ملنے جائیں تو وہ آپ کا ان الفاظ میں خیر مقدم کرے گا کہ "تشریف لائیے۔ یہ آپ ہی کا گھر ہے" (Esta en su causa) یا آپ اس کی گھڑی یا گاڑی یا کسی چیز کی تعریف کریں تو کہے گا "قبول فرمائیں، آپ کی نذر ہے"۔ یہ سن کر آپ یقین نہ کرلیجیے گا۔ کیونکہ حقیقت میں وہ اسے دینا نہیں چاہتا، محض تواضع کے وہ کلمے دہرا رہا ہے جو ہزار سال سے یہاں استعمال میں ہیں کسی اچھے ناچ یا گانے پر ہسپانوی کا بار بار

(Ole) پکارنا بھی "واللہ، طیّب" کی یادگار ہے۔

اپنے سپین میں قیام کی تقریباً آدھی مدّت یعنی چار صدی تک سپین والوں کے ساتھ مسلمانوں کا برتاؤ ایسے رحم وکرم کا تھا کہ کسی فاتح نے اپنے مفتوحوں سے نہ کیا تھا۔ وہ ہسپانویوں کی جہالت، گندگی، گنوارپن کو حقارت سے دیکھتے تھے اُنھی نے یہاں آکے بہت جلد چھوٹی سے چھوٹی بستی میں لوگوں کے لیے عام حمام بنوائے، لیکن بڑی رواداری برتتے تھے۔ شاذ ونادر ہی نصاریٰ یا یہود کو اسلام لانے کی تاکید کی۔ اس روشن خیالی کا ایک سبب، جو ذرا بھی لائق تعریف نہیں یہ تھا کہ ان اہل کتاب سے انھیں معقول جزیہ وصول کرنے کی فکر رہتی تھی اور مسلمان اس محصول سے مستثنےٰ تھے۔ خود غرض فرماں رواؤں کو مسلمان بنانے کی اتنی فکر نہ تھی جتنی اپنے خزانے بھرنے کا شوق تھا۔

مسلم سلطنت کی ان پہلی چار صدیوں میں یہودیوں کو وہ راحت وعیش نصیب ہوا، جو پہلے سپین میں کبھی اُنھوں نے نہ دیکھا تھا۔ علمی اور دماغی مساعی میں وہ موروں کے شریک ورفیق رہے۔ یہودی مؤرخ، طبیب، فلسفی اور ساہوکار مسلمانوں کے شہروں میں خوب پھلے پھولے اور معزز مانے جاتے تھے۔ ایک سے زیادہ مسلم مملکت میں یہودی سیاست داں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔

نصاریٰ اپنے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ انھی کے اپنے قاضی ان کے مقدمے فیصل کرتے اور پادری دینی امور انجام دیتے تھے۔ وہ اپنے ہی گرجوں میں نمازیں پڑھتے اور جہاں کہیں الگ گرجا نہ ہوتا تو کسی قریبی مسجد کے مغربی نصف میں اپنی قربان گاہ کھڑی کر لیتے تھے۔ البتہ مشرقی (یعنی سمت قبلہ) کا حصّہ صرف مسلمانوں کی نماز کے لیے مختص ہوتا تھا۔

مسلم فرماں روا کی عیسائی رعایا "مزارب" (Mozarab = عربی مستعرب سے)

کہلاتی تھی۔ اس کے رسم و رواج، عادات و مذاق میں رفتہ رفتہ مشرقیت سرایت کر جاتی تھی، کیونکہ اس عربی اسلامی ماحول میں مسیحی اثرات بہت کم نفوذ کرتے تھے۔ بعض مزارب مسلمان ہوئے لیکن تعداد کثیر صدیاں گزرنے پر بھی اپنے کیتھولک عقائد سے چمٹی رہی، البتہ عربی زبان کے ملک میں رواج پانے سے مزارب اپنی ”رومانسی“ (Romance) لاطینی آمیز مقامی زبان۔ بولی جو رومنوں کے زمانے سے چلی آتی تھی بھول گئے اور ان کے لیے اناجیل کا عربی میں ترجمہ کرنا ضروری ہوا۔ ۱۰۸۵ء میں قشتالیہ کے عیسائی بادشاہ الفانسو نے طلیطلہ شہر پر قبضہ کیا تو اس کی فرانسیسی بیوی کو یہ سن کر بہت صدمہ ہوا کہ مزارب پادری قدیم غوطی مراسم کے ساتھ نمازیں پڑھاتے ہیں۔ حالانکہ یورپ کے دوسرے ملکوں میں وہ رسوم و شعائر مدت سے ترک کردیئے گئے تھے۔ اسی طرح معلوم ہو کہ یہ پادری عربی زبان میں اناجیل پڑھتے اور وعظ کرتے ہیں۔ ملکہ نے تاکید کی کہ یورپی گرجوں کی رومن رسوم اختیار کی جائیں۔ پادریوں نے انکار کیا۔ تب ملکہ نے حکم دیا کہ نماز کی رومن اور غوطی کتابیں دونوں جلتی آگ میں ڈالی جائیں، جو بہتر حالت میں سلامت رہ جائیں وہی سچی مانی جائیں گی۔ آگ کے ذریعے آزمائش کا یہ طریقہ قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں عام تھا۔ چنانچہ یہ آزمائش کی گئی۔ جب آگ بجھی تو پرانی غوطی کتابیں جو جھلی پر لکھی ہوئی تھیں، اچھی خاصی حالت میں بچ گئی تھیں لیکن رومن میں نماز کی کتابیں نئے کاغذ پر تحریر تھیں وہ جل کر خاک ہوگئیں۔ اس پر بھی بیگم نہیں مانی اور حکم دیا کہ یہ مسئلہ بزورِ شمشیر طے کیا جائے گا۔ اس نے اپنی طرف سے جنگی شہسوار (نائٹ)، انتخاب کیا اور مزاربوں نے اپنا ایک حمایتی جنگ آزما تلاش کرلیا۔ ان دونوں کا مقابلہ ہوا، اس میں بھی ملکہ کا تلوزیا ہار گیا۔ اب وہ بہت زچ ہوئی اور آخر بین بین صورت یہ نکالی کہ نو تعمیر گرجوں میں تو غوطی مراسم اور شعائر اختیار نہیں کیے جائیں گے لیکن پرانے گرجوں میں بدستور عمل ہوتا رہے گا

اسے نہیں روکا جائے گا۔ بایں ہمہ تھوڑی مدت بعد رومن مراسم ہی ہر جگہ رائج ہو گئے اور سپین بھر میں صرف طلیطلہ کے کلیسا میں ایک مزارب عبادت خانہ ایسا رہ گیا ہے جہاں آپ آج بھی اسی طرح سے نماز کی رسوم ادا کر سکتے ہیں ۔ جیسے بارہ سو برس قبل شاہ رَوڈرک اور اُس کے دراز قامت بھورے بال والے وِس گاتھ امراء پڑھا کرتے تھے۔

عبدالرحمٰن کے خانوادے کے آیندہ بادشاہوں نے اپنے لیے "خلیفہ" یعنی مسلمانوں کے دینی امام' کا لقب اختیار کر لیا تھا۔ اس مذہبی سرداری نے ان کی عظمت ضرور بڑھائی لیکن اس پر بھی سارے ملک کو وہ متحد نہیں کر سکے اور موروں کے بڑے بڑے شہر جیسے طلیطلہ (Toledo) اور سر قسطہ (Saragosa) خلافت قرطبہ کو تسلیم کرنے سے برابر منحرف رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سپین کے شمال میں جو پٹی فتح ہونے سے بچ رہی تھی۔ وہاں کے عیسائی رئیسوں نے مسلمانوں کی باہمی نااتفاقی سے فائدہ اُٹھایا اور اپنے علاقے میں اضافہ کر لیا۔ متنازعہ فیہ زمین کا کوئی قطعہ یہاں سے لیا، کچھ اور کہیں سے جہاں ایک مسلمان امیر کے خلاف اس کے حریف مسلمان کی مدد انھیں حاصل ہو گئی۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت آئی کہ سارا ملک بہت سی آزاد ریاستوں کا جال نظر آنے لگا، جس میں زیادہ تر موروں کی اور بعض عیسائی رئیسوں کی مملکت تھیں۔ اکثر ایک ہی معرکے یا کسی بڑے قلعے کی فتح سے یہ نقشہ بدل جایا کرتا تھا۔ اگرچہ مسلم والیانِ ریاست مستقل تنخواہ دار فوجیں نہیں رکھتے تھے لیکن عام معرکہ آرائی کے وقت بڑا لشکر فراہم کر لیتے تھے جس کا مقابلہ مشکل ہوتا تھا۔ ان کی اصل قوت سوار فوج ہوتی تھی اور کہنا چاہیے کہ وہ اپنی زندگی ہی گھوڑوں کی پیٹھ پر گزارتے تھے۔ ناممکن تھا کہ کوئی مسلمان اعلیٰ درجے کا شہسوار نہ ہو۔ کسی بڑی جنگ کی تیاری ہوتی تو شمالی افریقہ، مصر و شام تک سے اہل قبیلہ اپنے برادری والوں کی مدد کے لیے سپین پہنچ جاتے تھے۔ یہ جنگ آزما، خوبصورت، سبک رفتار گھوڑوں پر سوار ہوتے

اور اس کمال کے ساتھ لڑتے کہ معلوم ہوتا گھوڑا اور سوار ایک جسم ایک قالب ہیں۔ان کے ہتھیار ہلکے مگر نہایت کارگر ہوتے۔ ہر شخص عمامے کے نیچے کلاہ نما لوہے کا خود اور جسم پر زرہ لگائے ہوئے ہوتا۔ چوبی خانوں کی سبک سپر، بانس کی چھڑ کا پتلا نیزہ، عمدہ سے عمدہ فولاد کی تلوار و خنجر سے مسلح ہوتا تھا۔مسلم لشکر کے ساتھ مزارب اور یہودی پیادہ تیر کمان اور فلاخن لیے چلتے لیکن حقیقت میں ان غیر مسلم سپاہیوں کی حیثیت سواروں کے خدمتگاروں سے زیادہ نہ تھی۔انھیں سواروں کے مقابلے میں آدھی خوراک کا راتب دیا جاتا تھا۔

دسویں صدی عیسوی (چوتھی ہجری) میں ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ منصور نامی مسلم سپہ سالار کے ہاتھوں چھوٹی چھوٹی عیسائی ریاستوں کو جان کے لالے پڑ گئے، جو تھوڑے دن سے پھر ہاتھ پاؤں نکالنے لگی تھیں۔منصور ہر فوج کشی میں کئی کئی سرکش مور امیروں کو اطاعت پر مجبور کرتا اور عیسائی علاقے بھی چھین لیتا تھا۔عیسائی جو آہستہ آہستہ جنوب میں قدم بڑھا رہے تھے، انھیں اس نے پھر اپنے پہاڑی مامنوں کی طرف دھکیلا اور بڑھتے بڑھتے انتہائی شمال کے پہاڑوں میں گلیشیہ (= جلیقیہ) کے سب سے مقدس عیسائی کلیسا اور خانقاہ سنتیاگو (Santiago de Compostelo) تک پہنچ گیا۔کلیسا کی صلیبیں اور مقدس مورتیاں توڑ دیں، بہت سے بیش قیمت تبرکات اور گرجا کے بڑے گھنٹے لے گیا جو جامع قرطبہ میں فانوس کے طور پر الٹے لٹکائے گئے، جیسے قدیم زمانے میں ہلکی روشنی کرنے کے لیے لگانے کا دستور تھا۔اس تاخت کے بعد منصور کو یقین تھا کہ دینِ مسیح کے حامیوں نے ہمت ہار دی اور اگلی فوج کشی میں وہ ان کی مزاحمت کا بالکل خاتمہ کر دے گا لیکن امید کے خلاف عیسائی رئیسوں نے شکستہ دل فوجوں کو از سرِ نو جمع کیا اور مذہبی جوش کی ایسی روح بھری کہ اس لشکر نے منصور کو شکست دی اور اس کی منتشر فوجوں کو مار بھگایا۔خود منصور کو ناکامی کا ایسا رنج ہوا کہ لڑائی میں جو

زخم آئے تھے، اُن کے علاج معالجے کو منع کر دیا اور تھوڑے دن بعد ہی انتقال کر گیا۔ اس کے مرتے ہی وہ طاقتور سلطنت جو اُس نے تیار کی تھی بہت جلد کمزور ہو گئی۔ اور منصور کی وفات کو سات سال ہی گزرے تھے جب کہ ایک مور امیر نے سرکشی کی تو قستالیہ کا مسیحی فرماں روا سانکو گارسیا اس کا حلیف بن کر دار الخلافت قرطبہ کے دروازوں تک بڑھنے کے قابل ہو گیا۔ مور امیر نے اپنے مسیحی حلیفوں کو اس محترم شہر کے اندر قدم رکھنے کی اجازت تو نہیں دی البتہ ان کے تعاون کے عوض میں بہت سا مال غنیمت اور جو کچھ اُنھوں نے لوٹا تھا وہ سب انھیں دے کر لدا پھندا اپنے گھروں کو واپس بھیجا۔

موروں کے انھی آپس کے جھگڑوں میں چند سال بعد ایک فریق نے حاکمِ وقت سے بغاوت کر کے شہر قرطبہ کو تاراج کیا۔ ان فسادات میں بہت سے محلّات اور مسجدوں کو آگ لگا دی گئی۔ بہت سے امرار اور علما جان سے مار دیے گئے۔ طوائف الملوکی نے خلافتِ قرطبہ کو پارہ پارہ کر دیا۔ اس طوفانِ بے تمیزی میں موروں کی حکومت اتنی بے اثر اور منتشر ہو گئی تھی کہ عیسائی والیانِ مملکت جو نسبتہً زیادہ متحد تھے اور مشترک مقصد کے لیے باہمی اختلافات کو بھلا دینے کی صلاحیت رکھتے تھے، ممکن تھا کہ اسی گیارھویں صدی عیسوی میں سارا اسپین دوبارہ فتح کر لیتے، اگر شمالی افریقہ کے مور مجاہدین کی ایک اور جماعت سپین آکر مسلمانوں کی حکومت کو نہ سنبھال لیتی۔

یہ تندخو نووارد مطلق العنان بادشاہی کرنا چاہتے تھے۔ ان میں ذرا بھی رواداری نہ تھی۔ مسیحی اور یہود کے معابد کو آگ لگا دیتے اور ان کو گھروں سے نکال باہر کرتے تھے۔ خود مسلمانوں کو جو اُن کے خاص عقائد کی مخالفت کرتے، قتل کر ڈالتے تھے۔ پھر پہلے حملہ آوروں کو اندلسیہ کے جادو نے رفتہ رفتہ مسخّر کیا اور جنگ جوئی کی بجائے نرمی سکھائی، تو آبنائے بار کے خانہ بدوشوں کا ایک اور سیلاب سپین میں آیا اور نئی

مصیبتیں اور شدتیں اپنے ساتھ لایا۔ مذہبی جنون میں ان قبائیلیوں نے سپین کے مسلمانوں کے بہت سے بڑے بڑے کتب خانے تک برباد کر دیے۔

لیکن اب مسلمانوں کے سپین پر تسلط کا خاتمہ قریب آگیا تھا۔ تیرھویں صدی عیسوی (= ساتویں ہجری) کے وسط میں پرتگال نے ان کا طوقِ حکومت اُتار پھینکا اور ایک آزاد عیسائی مملکت قائم کر لی۔ اسی طرح دوسرے مسیحی ملوک و امرا، سپین کے علاقوں پر قابض ہو گئے، صرف اندلسیہ میں غرناطہ (Granada) کی مسلم حکومت سلامت رہ گئی اور یہاں مزید دو سو برس تک مشرقیت کے چراغ کی نظر فریب دھیمی روشنی نور افشاں رہی۔

حواشی صفحہ ۱۲ و ضمیمہ باب سوم

(از مترجم)

نمبر ۱۔ متعلق جنگ، طارق و روڈرک۔ (ص ۲۷)

یہ فیصلہ کن معرکہ جس ندی کے کنارے ہوا، اب سلاڈو کہلاتی ہے، عرب فاتح اسے وادی لکہ یا بکہ کہتے تھے۔ وہ ایک اور نام سے رِل مل کر Guadlete بن گیا، جو ایک اور ہی ندی کا نام ہے۔

نمبر ۲۔ روڈرک کا قتل (ص ۲۷)

یہ روایت کہ شاہ روڈرک کا سر کاٹ کر مکہ معظمہ بھیجا گیا، صرف بے بنیاد اور جھوٹی ہی نہیں ہے بلکہ اسلامی تاریخ و تہذیب سے کامل ناواقفیت یا سخت عناد ظاہر کرتی ہے۔ زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ لائق مصنف نے اسے کمال دیدہ دلیری سے مسلمان مورخوں سے منسوب کر دیا ہے۔ یہ سراسر اتہام ہے۔ مسلمانوں کی تاریخوں کا تو ذکر ہی کیا ہے کسی معتبر سپینی کی تاریخ میں بھی یہ روایت موجود نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو حِتّی History of the Arabs لندن ۱۹۵۸ء۔ ص ۴۹۴۔ قب: دوزی، اسکاٹ وغیرہ، نیز انسائیکلوپیڈیا بری ٹانکا۔ طبع چہارم تحت مادہ سپین)

نمبر ۳۔ جامعِ قرطبہ (ص ۳۱)

اس عظیم الشان عمارت کے سلسلے میں یہ بتانا ضروری تھا کہ اس مسجد میں دنیائے اسلام کی پہلی سب سے بڑی جامعہ قائم کی گئی تھی جس میں مختلف علوم کے منتخب اساتذہ دور دور سے بلائے گئے اور ان کی فیاضانہ سرپرستی کی جاتی تھی۔ طلبہ میں ہر مذہب و ملت

کے لوگ اس چشمۂ علم سے سیراب ہوتے تھے۔ جامعہ کے مشہور علما اور دوسرے حالات عربی تاریخوں اور تذکروں میں جا بجا تحریر ہیں۔

قرطبہ کی شاہی عمارتوں میں کم سے کم "الزہرا" کا ذکر بھی آنا چاہیے تھا، جس میں چار سو ایوان طرح طرح کی ندرتوں سے مزین تھے۔ (: ابن خلدون' ج ۴-۱۴۴-
نفح الطیب، ج ۱- ۳۴۴. وغیرہ)

ضمیمہ

ڈریپر اپنی مشہور کتاب A History of the intellectual development of Europe میں لکھتا ہے۔ (طبع لندن ۱۹۱۰ - ج ۲ - ۳۱)

"جس زمانے میں قرطبہ کے کوچہ و بازار میلوں تک سنگ بستہ اور دورویہ مکانات کی روشنیوں سے جگمگاتے تھے۔ پیرس کے مکانات ہی میں بارش کے دن ٹخنوں تک کیچڑ میں چلنا پڑتا تھا اور لندن میں اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ (مسلم اندلس کا) یہ تہذیب و تمدن صدیوں تک ان یورپی شہروں کو نصیب نہیں ہوا تھا۔"

یورپ کے اہل علم کو اب یہ بات ماننی پڑی ہے کہ یورپ کی نئی تہذیب کا چراغ مسلم اندلس کی بدولت روشن ہوا صلیبی جنگوں میں یورپی اقوام کا شام و مصر کے مسلمانوں سے سابقہ پڑا تو ان کی آنکھیں کھلیں اور یورپ میں نشاۃ ثانیہ کو قوی تحریک ملی۔ زیر نظر کتاب اگرچہ مختصر ہے اور اس میں اندلس کے مسلم دور کو صرف ایک چھوٹے سے باب (سوم) میں محدود رکھا ہے لیکن اس میں بھی فراخ دلی ایک طرف پوری تحقیق اور انصاف سے بھی کام نہیں لیا گیا حالانکہ خود انگریزی زبان میں اس موضوع پر مستقل کتابیں موجود ہیں۔ اُردو میں بھی مسلم اُندلس کی تاریخ پر عربی و انگریزی کے ترجمے اور متفرق رسائل اور مقالات لکھے گئے ہیں۔ ناظم موسسۂ فرینکلن لاہور کے ایما سے ہم یہاں اندلسی مسلمانوں کے صرف مشہور علمی کارناموں کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ اصل کتاب میں جو قدرے فریقانہ تنگ دلی محسوس ہوتی ہے اُس کی اُردو ترجمے میں فی الجملہ تلافی ہو جائے۔

عربی زبان یعنی صرف و نحو، لغت، شعر، ادبیات پر اندلس میں جو کام ہوئے، ان سے قطع نظر کرکے پہلے تاریخ و جغرافیہ کو لیجیے تو آپ کو اندلسی مسلمانوں کے بہت سے درخشاں

نام نظر آئیں گے جن کی اکثر کتابیں یورپ میں چھپیں اور وہاں کی زبانوں میں ترجمہ کی گئیں۔ مثلاً

۱۔ ابوبکر ابن عمر (ابن القوطیہ) مؤلف "افتتاح الاندلس"

۲۔ ابو مروان (عرف ابن حیان)، جس کی ضخیم تاریخ کا صرف ایک حصہ مل سکا اور یورپ میں "رجال الاندلس" کے نام سے چھاپا گیا ہے۔

۳۔ ابوالولید عبداللہ ابن محمد۔ مؤلف "تاریخ علمائے اندلس" جس کے تکملوں کا سلسلہ دو صدی تک چلتا رہا اور ۴۔ ابن یحییٰ الذبی کی "بغیات الملتمس" پر ختم ہوا، جس میں سبھی اہل علم اور فلاسفہ کے حالات جمع کیے گئے ہیں۔

۵۔ سعید ابن احمد، صاحب "طبقات الامم"

۶۔ لسان الدین ابن الخطیب، مؤلف "الاحاطہ فی اخبار غرناطہ" جس کا صرف خلاصہ دو ضخیم جلدوں میں چھاپا گیا ہے۔ اس فاضل مصنف نے فلسفہ، طب اور موسیقی الحان پر بہت سی اعلیٰ درجے کی کتابیں لکھی تھیں۔ ان میں قریب ایک تہائی (یعنی ۲۰) ابھی تک سلامت ہیں۔

۷۔ عبدالرحمٰن ابن خلدون، جس کی ضخیم تاریخ "العبر" اور حکیمانہ "مقدمہ" دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اہل یورپ اب اسے عمرانیات کا بانی اور علمی دنیا کا محسن مانتے ہیں۔

۸۔ ابو عبید البکری، صاحب "المسالک والممالک" اس مفصل جغرافیے کی صرف افریقہ سے متعلق جلدیں باقی رہیں۔

۹۔ الادریسی کو بھی اندلسی اہل تحقیق میں شامل کرتے ہیں جس کا جغرافیہ "نزہۃ المشتاق فی افتراق الآفاق" تعریف سے مستغنی ہے۔ اس وقت تک جغرافیے کی جتنی معلومات حاصل ہو سکی تھی، وہ ان سب کا جامع تھا۔

۱۰۔ ابن جبیر اندلسی حکومت موحدین کے زمانے میں غرناطہ کا والی بنایا گیا تھا۔ چھٹی

صدی ہجری (بارھویں عیسوی) کے اواخر میں اس نے اسلامی دنیا کا سفر کیا اور ایک عمدہ سفرنامہ لکھا جسے یورپ میں دو بار چھاپا گیا ہے۔

لائق مصنفہ نے یہ کہہ کر کہ عرب اہل علم نے ہیات کو جوتش اور کیمیا کو مہوسی بنا کر خراب کیا، اپنی بڑی ناواقفیت یا بے جا تعصب کا ثبوت دیا ہے۔ علم ہیات یا فلکیات میں اہل اندلس نے اعلیٰ درجے کی بلکہ انقلابی تحقیقاتیں انجام دی تھیں۔ ان میں سب سے پہلا فاضل (۱۱) ابوالقاسم مجریطی گزرا ہے جس نے خوارزمی کی زیچ کی ترمیم کی جو ان دنوں مشرق و مغرب میں مسلم تھی۔ یہی خدمت بڑے پیمانے پر (۱۲) زرقابی اور (۱۳) ابن افلح نے انجام دی۔

۱۴۔ لیکن بطلیموسی نظام کی سب سے پہلے جس عالم نے مدلل تردید کی اور بتایا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، وہ اندلس کا البطروجی، صاحب "کتاب الہیاۃ" گزرا ہے، جس کا لاطینی ترجمہ اسی چودھویں صدی میں یورپ کے ملکوں میں شائع ہو گیا تھا۔ وہ کوپرنیکس سے تقریباً دو سو برس پہلے کا محقق ہے اور اسی لیے آرنلڈ (Legacy of Islam، ص ۳۹۰) اور سارٹن (مقدمہ تاریخ سائنس۔ ج ۲، ۲۹۹) میں اعتراف کرتے ہیں کہ کوپرنیکس کا جدید نظامِ ہیات علمائے اندلس خصوصاً بطروجی کا رہینِ منت تھا۔

علومِ طب کے نامور عالموں میں چند نام یہ ہیں:۔

۱۵۔ احمد الغافقی، صاحب کتاب "الادویہ المفردہ"

۱۶۔ یحییٰ اشبیلی، مصنف "کتاب الفلاحہ" جس کے سپینی ترجمے سے آج سات آٹھ سو برس بعد تک اس ملک میں کام لیا جاتا رہا۔

۱۷۔ عبداللہ ابن بیطار، قرونِ وسطیٰ کا سب سے نامور عالم نباتیات اندلس کا باشندہ

تھا۔ لیکن زندگی کا آخری حصہ مصر و دمشق میں گزرا۔ اس کی کتاب "الجامع فی الادویہ المفردہ" کہ ۴ جلدوں میں مصر میں طبع اور یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوئی، نباتات نیز حیوانات و معادن پر معلومات کا خزانہ ہے۔ امراض اور ادویہ کی قرابادین "المغنی" موسوم ہے۔

۱۸۔ رشید الدین صوری، ابن بیطار کا ہم عصر اور اس اعتبار سے یگانۂ عصر مانا گیا کہ اپنی کتاب الادویہ کو جڑی بوٹیوں کی صحیح رنگین تصاویر سے مزین کیا تھا۔

اندلس میں بہت سے صاحبِ تصنیف و تحقیق طبیب ہوئے جن کے حالات تاریخ اور تذکرے کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ اس اجمالی خاکے میں ہم صرف دو سب سے نامی طبیبوں کا ذکر کیے دیتے ہیں۔

۱۹۔ ابوالقاسم زہراوی، جس کی شہرۂ آفاق کتاب "التصریف لمن عجز عن التالیف" فن جراحی میں تمام سابقہ کتابوں سے سبقت لے گئی۔ اس میں اعضا اور آلاتِ جراحی کی بہت سی تصویریں دی گئی ہیں۔ ان اجزا کا لاطینی ترجمہ یورپ کے ملکوں میں اٹھارویں صدی تک شاملِ درس تھا۔ غالباً آخری طباعت اوکس فورڈ میں ۱۷۸۲ء میں ہوئی۔

۲۰۔ ابو مروان عبدالملک معروف بہ ابنِ زہر۔ اندلس کا سب سے بڑا طبیب، رازی اور ابن سینا کی ٹکر کا حکیم گزرا ہے۔ اپنے دوست اور مشہور فلسفی ابن رشد کی تحریک پر اس نے کتاب "التیسیر فی المداوۃ والتدبیر" تالیف کی جس کے ترجمے اسی صدی میں یورپ میں شائع ہوئے اور کئی سو برس تک پڑھائے جاتے رہے۔

مگر جدید یورپ میں مسلم اندلس کے فلاسفہ کی بہت قدر و منزلت کی جاتی ہے۔ کیونکہ ان میں بعض اسلامی عقائد راسخہ کی قیود سے آزاد خیال کیے جاتے ہیں۔ ان میں سرفہرست

۲۱۔ ابن باجہ تھا۔ جس کا مشہور مقالہ "تدبیر المتوحد" ایک عبرانی ترجمے کی صورت میں سلامت رہا۔

۲۲۔ ابوبکر عبدالملک ابن طُفیل۔ فلسفہ ارسطو کا شارح اعلیٰ درجے کا طبیب اور اسی کے ساتھ وزیر سلطنت رہا۔ اس کا شاہکار، کتاب "حیّ ابن یقظان" اسی نام کی ابن سینا کی کتاب سے، معانی اور بیان دونوں میں سبقت لے گئی اور مشرق و مغرب دونوں خطّوں میں نہایت مقبول ہوئی۔

۲۳۔ ابوالولید احمد ابن رُشد۔ ابن طفیل کا ہم عصر تھا۔ زمانۂ دراز تک ممالک یورپ میں اس کا فلسفہ پڑھایا جاتا رہا۔ وہ آج بھی دنیا کے مشہور ترین فلاسفہ میں شمار ہوتا ہے۔

۲۴۔ ابوبکر علی محی الدین ابن عربی۔ فلسفۂ وحدت الوجود کا امام بھی اندلسی تھا اگرچہ بہت زمانے تک ممالک مشرق میں رہا۔ کثیر تصانیف میں "فصوص الحکم" اور "فتوحات مکّیہ" آج تک اہلِ تصوّف میں مقبول ہیں۔

ہم نے اس مختصر تبصرے میں مسلمانانِ اندلس کے عربی لسانیات، شعر و ادب، نیز مذہبی مسائل و مباحث پر تحقیقی کاموں کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن چونکہ لائق مصنفہ مسیحی سپین کی افسانہ نویسی، خصوصاً عیاروں کے قصّے ("پکارشک" ناولوں) کا بڑے ذوق شوق سے تذکرہ کرتی ہیں (باب ہفتم) لہذا اتنا اضافہ بے محل نہ ہوگا کہ ان ادبی اصناف اور شاعرانہ تخیلات کا اصلی سرچشمہ بھی اب یورپ کے اہلِ تحقیق اندلسی مسلمانوں ہی کی نظم و نثر کی تصانیف کو قرار دیتے ہیں (مثلاً حِتّی، تاریخ عرب۔ ۵۵۹ بعد۔ نیز دیکھیے دوزی کی تاریخ (مسلم) اندلس۔ نکلسن کی تاریخ ادبیات عربی۔ وغیرہ)

باب چہارم

بازیابی

مسلم حملہ آوروں کو اپنی کشور کشائی کی انتہائی کامیابی کے وقت میں بھی سپین کی شمالی سرحد کے دشوار گزار پہاڑوں اور کوہستانی اضلاع پر پورا تسلط حاصل نہ ہو سکا۔ مسیحی ہسپانوی جو فاتح مسلمانوں کے سامنے سے فرار ہوئے گلیشیہ، استوریا، باسک اضلاع اور نوار کی پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں آزاد ہی رہے۔

موروں سے بھاگ کر پناہ لینے والوں میں ایک وِس گاتھ (غوطی) شہزادہ پلے یو (Pelayo) گوادلیت کی جنگ ۷۱۱ء (= ۹۲ھ) میں بچ نکلا اور استوریا کی ایک تنگ پانچ میل طویل گھاٹی کے سرے پر بہت بڑے غار کے اندر جسے "کوادونگا" کہتے تھے، ٹھکانا بنایا۔ یہیں اس کے مٹھی بھر ساتھیوں نے۔ غوطی قوم کی رسم کے مطابق اپنی ڈھالیں بلند کیں اور اس کے بادشاہ ہونے کا اعلان کیا۔ موروں کو اس ڈیڑھ اینٹ کی نئی بادشاہی کی خبر پہنچی تو اُنھوں نے ایک رسالدار کو سواروں کی ایک جمعیت دے کر اُدھر بھیجا اور اس رسالدار نے پلے یو کو جاگیر اور خطاب دلوانے کا وعدہ کیا بشرطیکہ وہ اطاعت قبول کرلے۔ تنگ گھاٹی سے باہر جانے کا راستہ موروں نے روک رکھا تھا اور وہ آہستہ آہستہ اندر بڑھ رہے تھے۔ قبولِ اطاعت کی بجائے پلے یو اور اس کا مختصر سوار دستہ دشمن پر جا پڑا، گھاٹیوں کے اوپر چٹانوں میں عورتیں، بچے، بوڑھے چھپے بیٹھے تھے، اُنھوں نے اوپر سے بڑے بڑے پتھر اور درختوں کے تنے دھکیل کر حملہ آوروں کی قطار پر گرائے اور وہ ان کے نیچے دب کر ہلاک ہوئے۔ ساری مور جمعیت یہاں کھیت رہی اور اگرچہ

تعداد کے اعتبار سے عیسائیوں کی یہ فتح کچھ وقعت نہ رکھتی تھی لیکن اس نے ان کا دل بڑھایا اور مزید جد وجہد کی ہمت دلائی۔ اسی بنا پر سپین کی از سر نو (مسیحی) فتح یا بازیابی کا آغاز کُواد ونگا کا معرکہ ۸۱۸ء، قرار دیا گیا ہے۔ تدریج اور کافی تکلیف مگر عزم راسخ کے ساتھ مسیحی سپین نے دوبارہ اُبھرنا شروع کیا اور گلیشیہ تا قیطلونیہ کے شمالی صوبوں سے آہستہ آہستہ جنوب کی طرف قدم بڑھایا۔ دریائے ابرو تک پہنچنے کے بعد پھر دورو اور ٹیگس کی طرف اس کے اثرات نے نفوذ کیا۔

سپین کے نیم وحشی چھوٹے چھوٹے گروہوں کا، جن کے ہتھیار بہت گھٹیا تھے، موروں کی بہت بہتر فوجوں پر غالب آتا دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے لیکن اس کامیابی کا ایک سبب یہ پختہ عقیدہ تھا کہ مسیحیت کا ایک مافوق الفطرت حامی اُن کے ساتھ ہو کر جنگ کرتا ہے۔ یہ خدائی مددگار سینٹ جیمس تھا جسے سپین میں "سَنتیاگو کمپوس تلا" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آگے چل کر سپین کا مربّی اور سرتاج اولیا، ہمت بندھانے والا اسی کو مانا گیا۔ کئی مسیحی بادشاہ اور سپہ سالار قسمیں کھاتے تھے کہ جنگ سے پہلے یا عین گھمسان کی لڑائی میں ہم نے سَنتیاگو کو سفید گھوڑے پر سوار چمکتی تلوار گھماتے دیکھا۔ اس ولی کا خیال آتے ہی ہسپانوی کے دل میں دین و وطن کا جوش بھڑک اُٹھتا تھا۔ ملک کی بازیابی کی جنگ صحیح معنی میں صلیبی جہاد بن گئی تھی اور سپینی لشکروں کا سرخیل سنتیاگو صدیوں کے دشمن (مسلمانوں) سے انھیں لڑانے میدان میں نکل آیا تھا۔ قدیم روایتوں میں بیان کیا گیا ہے کہ جیمس ولی دین مسیح کی دعوت دینے سپین آیا تھا۔ معلوم نہیں ان روایتوں میں کونسا جزو صحیح اور کتنا حصہ خیالی افسانہ ہے۔ سپین والے کہتے تھے کہ یہ ولی فلسطین میں شہید کیا گیا تو اس کے سچے عقیدتمندوں نے اس کی لاش سنگ مرمر کے صندوق میں رکھی اور معجزے کے طور پر وہ صندوق سمندر پر بہتا چلا، ایک فرشتہ اسے دیکھے رہا تھا، یہاں تک کہ گلیشیہ کے ساحل

پر یہ صندوق آ کے رک گیا اور یہ ولی نویں صدی عیسوی تک وہیں آرام کرتا رہا تاآنکہ ایک بشپ تھیوڈومرنامے نے ساحل سے عجیب طرح کی روشنیاں رات کے وقت بھڑکتی دیکھیں۔تحقیق کرنے سے قبر کا پتہ چلا جس کے اندر ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ پھر خواب اور مکاشفے کے ذریعے سے پادری کو علم ہوا کہ یہ سپین ہی کے داعی سنتیاگو کی ہڈیاں ہیں۔ اس خوف سے کہ کہیں بحری قزاق یہ متبرک یادگار نہ لے جائیں۔ چند میل اندر لے جا کر ہڈیاں مقام کمپوس تلا میں دفن کی گئیں۔ جہاں مقامی لوگوں نے قبر پر ایک بھدی سی درگاہ بنا دی۔ اس کراماتی دریافت کی شہرت ہوئی تو لوگ جوق در جوق کمپوس تلا آنے لگے اور دعائیں مانگنے لگے کہ پھر پورا ملک مسیحیت کے قبضے میں آجائے۔ اس کے بعد عیسائی ملوک وامرا جو مسلمانوں سے جنگ کرتے وہ کامیابی کی صورت میں زر و جواہر کے قیمتی چڑھاوے سنتیاگو کی درگاہ پر چڑھاتے تھے۔ مسلمان سپاہ سالار منصور نے درگاہ کے قیمتی چڑھاوے لوٹے تو سنتیاگو کی ہڈیاں یہاں نہ پائیں کیونکہ وہ چپکے سے نکال کر دوسری جگہ پہنچا دی گئی تھیں۔ آجکل کمپوس تلا کے شاندار کلیسا میں ایک چاندی کے صندوق میں یہ ہڈیاں محفوظ بتائی جاتی ہیں۔

قرونِ وسطیٰ میں سنتیاگو کی درگاہ یورپ بھر میں سب سے زیادہ مشہور ہو گئی۔ انگلستان، ہالینڈ، جرمانیہ، اطالیہ تک سے لوگ اس کی زیارت کرنے آتے تھے۔ یہاں کی نشانی گھونگے ہوتے تھے۔ انھیں جرمن اسقفوں کے لبادوں میں، ایک فرانسیسی بادشاہ کی زرہ میں، انگریز کاشتکاروں اور ولندیزی سوداگروں کے کوٹوں میں سیا ہوا سنتے ہیں۔ سنتیاگو کے راستے پر جگہ جگہ خانقاہیں بن گئی تھیں کہ زیارت کو آنے والے مسافروں کے قیام و طعام کا بندوبست کریں۔ ان میں راہب اور گشت لگانے والے بھاٹ زائرین کا دل بہلانے کو پرانے قصے اور بہادری کی داستانیں گا گا کر سناتے تھے۔ "رولان کا رزمیہ گیت" خیال کیا جاتا ہے کہ انھی منظوم قصوں سے مرتب ہوا جنھیں

کمپوس تِلا کے زائرین راستے میں گاتے سُنا کرتے تھے۔

رولان کی شہرت کا ماخذ سپین ہی تھا۔ اسی کی ایک تاریخ میں سب سے پہلے یہ نام آیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب شارل مَین موروں کے شہر سرقسطہ پر حملہ کرکے واپس فرانس لوٹا تو اس کی فوج کوہستان پائی رین کے درے رون کس والس سے گزری۔ یہاں تک سب خیریت رہی۔ شارلمین بہت قیمتی سامان سرقسطہ سے لوٹ کر لایا اور اب باسک علاقے میں تھا، جہاں کے قبائل سے دوستی کے معاہدے تھے۔ لیکن اگلی فوج گزر جانے کے بعد پچھلے حصّے میں گراں بہا لوٹ کا سامان جاتے دیکھ کر باسک قبیلوں پر طمع غالب آگئی اور اُنھوں نے اس تنگ درے میں شارلمین کی فوج پر اسی طرح سے حملے شروع کیے جیسے ساٹھ برس پہلے پلے یو کی رعایا نے گھاٹی میں گھرے ہوئے موروں کو ہلاک کیا تھا یعنی بڑے بڑے پتھر اور تنے اوپر سے لڑھکائے، چھپ کر تیر چلائے اور سنگ باری کی۔ درے سے گزرنے والے سپاہی بالکل بے بس ہو گئے تھے اور اتنی دیر میں کہ شارلمین مدد بھیج سکے اس کی آدھی فوج کا خاتمہ اور اموال غنیمت چوری کیے جا چکے تھے۔ ایک قدیم کتاب اس ہزیمت کے تذکرے میں "بریتانی سرحد کے محافظ رُوٹ لینڈ" (= رولان) "کے مارے جانے کی بھی خبر سناتی ہے۔ تاریخ میں صرف یہی چند لفظ اصل رولان کی نسبت محفوظ ہیں جس پر ہزارہا ورق کے افسانے تصنیف کر دیے گئے۔ باسکوں کی جگہ دغاباز مُور، طلسماتی سنکھ اور اَود نام کی خاتون جس نے رولان کا ماتم کیا، یہ سب کہانیاں کمپوس تِلا کی جاترا کو جانے والوں کے لیے گھڑی گئیں۔

مگر سپین کے اپنے مقامی سورما کچھ کم نہ تھے۔ قدیم وقائع اور بہت سی کتھائیں ان دیسی بہادروں کے گیت سناتی ہیں۔ فرانس کے سورما رولان کی طرح قرونِ وسطیٰ کے سپین کا قومی سورما سِد (Cid) دوسو سے زیادہ افسانوں کا میر ہے۔ اس کا اصلی

نام روی دیاز اور مولد بیوار تھا۔ اس بانکے جنگ جو نے موروں کا لقب سِد (= سیّد) اختیار کیا اور عوام کو ایسا گرویدہ کرلیا کہ وہ اسے مسلمانوں کے لیے بلائے ناگہانی اور عیسائیوں کا بڑا پشت و پناہ، مجسم سخاوت و بہادری تصوّر کرنے لگے جیسا کہ اس زمانے کے گیت اور چوبولے گواہی دیتے ہیں۔ یہ منچلا فرانس کے بادشاہ تک سے جھگڑ پڑا، جرمن شہنشاہ کو خاطر میں نہ لایا اور اطالیہ جاکر پاپائے رومہ کی تذلیل کی۔ اس کے دوسو افسانوں کے علاوہ ایک منظوم "سِد نامہ" بھی محفوظ ہے جو اُس کی وفات کے پچاس برس بعد لکھا گیا تھا۔ اس میں حقیقی زندگی اور کارنامے پڑھنے والوں کو جوش میں لاتے ہیں۔ اصلی مقامات واشخاص اور تاریخی معرکے مذکور ہیں اور سِد کے دلیرانہ کام بھی عقل اور قرائن کے خلاف نہیں ہیں۔ اس نظم میں جب قستالیہ کے بادشاہ الفانسو ششم دیاز کو اس کے وطن برگوس سے نکل جانے کا حکم دیتا ہے اور وہ چند وفادار دوستوں کے ساتھ اپنی بیوی ژمِنہ (Ximena) اور دو بیٹیوں سے رخصت ہوتا ہے تو یہ جدائی ایسی تکلیف دہ تھی جیسے گوشت کا ناخن سے جدا کیا جانا۔ گھوڑے پر چڑھ کر چلا تو دل میں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں، دور تک پلٹ پلٹ کر دیکھتا جارہا تھا۔

سِد جلاوطنی میں بیکار نہیں رہا۔ اس نے بہت سے موروں کو مارا۔ ان کے کئی قلعے چھین لیے، لوٹ مار سے مالا مال ہوگیا۔ برشلونہ کے مسیحی رئیس کو شکست دی اور آخر میں موروں کے شہر بلنشیہ پر قبضہ کرلیا۔ قیمتی نذرانوں سے شاہ الفانسو کو خوش کرلیا اور اجازت دی کہ وہی اس کی بیٹیوں (الویرہ اور سول) کے لیے امرا میں سے بر انتخاب کرے۔ مگر نظم میں آتا ہے کہ یہ داماد وحشی مزاج بزدلے تھے۔ اور سد کی خیالی زیادتیوں کے بدلے میں بیویوں کو مارتے تھے۔ وہ انھیں جنگل میں اکیلا چھوڑ آئے جس کی سِد نے بادشاہ سے فریاد کی۔ جھگڑے کا فیصلہ اس طرح ہوا کہ سِد کے دو سواروں کا دامادوں سے مقابلہ کرایا گیا۔ داماد ہار گئے اور لڑکیوں کو شاہی خاندان کے بہت اچھے شوہروں

سے بیاہ کر تلافی کی گئی۔

قدیم ہسپانوی اور مسلمانوں کے وقائع "سِد نامہ" اور عوامی گیتوں کے ساتھ یہاں تک تو متفق ہیں کہ سِد بہادر آدمی تھا، مگر تاریخ ایسے کوئی مثالی کردار نہیں دیتی بلکہ اس کی دلیری کے ساتھ اُسے ظالم اور دغاباز آدمی بتاتی ہے جو کسی بھی مسلمان فرماں روا کے ہاتھ اپنی خدمات بیچنے پر آمادہ رہتا تھا بشرطیکہ اچھی قیمت ملے اور مور بادشاہ کو جس نے اس پر اعتماد کیا اور بلنشیہ کے محاصرے کے لیے بھیجا۔ اس نے دغا دی اور جب فاقہ کشی کی وجہ سے اہلِ شہر نے ہتھیار ڈال دیے تو سد نے اُس پر خود قبضہ جمانے میں باک نہیں کیا۔ لیکن قرونِ وسطیٰ کے اس سورما کو اپنے زمانے کے معیار حق و باطل پر جانچتے وقت ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اُس کے وقت میں عیسائی اور مسلمان دونوں حیلہ بازی کو پسند کرتے تھے۔ خصوصاً دشمن کے مقابلے میں عرب وقائع نگار تک جو روی دیاز کو ملک کے حق میں قہرِ الٰہی لکھتے ہیں اُسے" ناموری کے شوق، سیرت کی پختگی اور دلاوری میں خدا کی قدرت کا کرشمہ" بتاتے ہیں۔

سِد کی وفات کے تین برس بعد موروں نے پھر بلنشیہ پر قبضہ کر لیا اور آیندہ تین صدی تک قابض رہے۔ یوں بھی مسیحی سپین کو اس جاہ طلب بندۂ غرض کی وجہ سے کوئی علاقہ یا قلعے حاصل نہیں ہوئے تاہم ملک و ملت کے لیے بہت سے بے غرض جانبازی کرنے والوں کا بھی وہ سورما بن گیا اور اس کے قصے سُن سن کر بہت سے علمائے مذہب، امرا، اور زمینداروں کے دلوں میں جوش بھر گیا کہ لڑائی جاری رکھیں اگرچہ مسلمان ان کو دھمکیاں دیتے تھے کہ ان کا سارا مال متاع تباہ کر دیا جائے گا۔

گیارھویں صدی کے ختم ہونے تک پہلے قسطالیہ (Castile) کی مملکت رفتہ رفتہ اِدھر اُدھر کے اقطاع ملا ملا کر سپین کی سب سے بڑی مسیحی حکومت ہو گئی اور وہاں کے بادشاہ الفانسو ششم نے جو سِد کا بھی ولی نعمت تھا، ۱۰۸۶ء میں طلیطلہ پر قبضہ

حاصل کرلیا۔ اسی کی بیوی نے مزارب پادریوں سے رسوم عبادت کے بارے میں وہ جھگڑا کیا تھا جس کا اوپر حال بیان ہو چکا ہے۔ یہ بادشاہ صاحب فکر و دماغ آدمی تھا اور اپنے پیش رو نیز اکثر مسیحی معاصرین کی نسبت اس میں اتنی رواداری ضرور تھی کہ مفتوحہ علاقوں کے مسلمانوں کو غلام نہیں بناتا تھا جیسا کہ دوسرے عیسائی رئیسوں کا طریقہ تھا کیونکہ اسے نظر آگیا تھا کہ مسلمان حکومت کی رواداری کی وجہ سے عیسائی رعایا کس قدر خوش رہتی تھی۔ اس لیے طلیطلہ پر قبضہ ہوا تو شہر کے مور باشندوں کے ساتھ اس نے انصاف اور عزت کا برتاؤ کیا اور دوسرے عیسائی ملوک و امراکی بھی سمجھ میں آگیا کہ مطمئن رعایا کے بغاوت کرنے کے قرائن کم ہو جایا کرتے ہیں۔ لہذا وہ بھی الفانسو کی ریس کرنے لگے۔ چھوٹی چھوٹی مسیحی ریاستیں شادی بیاہ کے ذریعے اور جنگی ضروریات کی وجہ سے مل کر بڑی مملکتیں بننے لگیں اور تدریجاً چارخانے کی بساط کی طرح سارا مسیحی سپین ایک واحد ملک بنتا چلا گیا۔ تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں قشتالیہ کا الفانسو ہشتم۔ نوار و ارغونہ (Aragon) کے بادشاہوں کے ساتھ مل گیا۔ اُنھوں نے کوہستان سیاہ کے ایک خفیہ درے سے نکل کر مسلمانوں کے لشکر پر چھاپہ مارا۔ یہ لشکر لوَاس دِتلوسا کے ڈھلواں میدان میں خیمے ڈالے پڑا تھا۔ عیسائیوں کو پوری کامیابی ہوئی۔ اور مور لشکر کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ یہ معرکہ جزیرہ نمائے سپین اور پرتگال میں موروں کی بالادستی ختم ہونے کا نشان تھا۔ بیس برس کے اندر ارغونہ کے بادشاہ نے بلیارک دل فریب جزیرے، مِنورکہ، امجورکہ اور ابیزہ فتح کرلیے، جو بحرِ متوسط میں ساحلِ سپین کے سامنے واقع اور آج تک اسی ملک میں شامل ہیں۔ یہ شاہ ارغونہ اُس وقت تک امیر برشلونہ کہلانے پر بھی فخر کرتا تھا۔

مگر مسیحی سپین کے اتحاد کا سب سے بڑا قدم ۱۴۶۹ء میں یہ اُٹھایا گیا کہ تخت قشتالیہ کی وارث شہزادی ازابلا کی شادی ارغونہ کے ولی عہد فردیناند سے کی گئی۔

یہ دونوں کیتھولک فرماں روا بہت حریص تھے۔ فردیناند کو ملک ستانی اور مطلق العنانی کی بے پایاں ہوس تھی اور ازابلا کو دھن تھی کہ کسی یہودی یا اسلامی عبادت کے الفاظ سپین کی فضا میں آیندہ نہ سنائی دیں۔ پورے سپین کو ایک کیتھولک قوم کی صورت میں متحد کرنا دونوں کی آرزو تھی اور دونوں موروں کی باقی ماندہ واحد مملکت غرناطہ کی فکر میں تھے۔ یہ مملکت بلاشبہ اب بہت کمزور ہو چکی تھی۔ اور مدت سے قستالیہ کے زیرِ سیادت آ گئی تھی۔ (وہاں کے مور بادشاہ نے ازابلا اور فردیناند کے کعبین نامے پر بطور سرکاری گواہ دستخط بھی کیے تھے) اس کے فرماں روا الحمرا کے حسین و جمیل قصر میں عیش اور تن آسانی کے مزے لیتے تھے۔ مقامی معاملات کے سوا دوسرے کاموں سے انھیں سروکار نہ تھا۔ نواحِ شہر کے میدانوں اور پہاڑوں میں باز اُڑانا، شکار کھیلتے پھرنا ان کا مشغلہ تھا، اور یا ممالک مشرق اور افریقہ کے اہلِ علم کی مہمان داری کرتے اور اپنے باغ و بساتین کی کسی بارہ دری میں کنارِ حوض بیٹھے علم و ادب اور حکمت کے بحث و مباحثوں کا لطف اُٹھاتے یا شعر و شاعری کرتے تھے۔ ان کی زندگی خاصی دل کش اور بے ضرر معلوم ہوتی تھی البتہ شہر و دربار میں برابر ساز باز ہوتے رہتے اور کبھی کبھی الحمرا کے نفیس چار خانے کا فرش خون کے چھینٹوں سے رنگین ہو جاتا تھا۔ دوسرے کبھی ایسا بھی ہوتا کہ یہاں کا کوئی شاہ یا شہزادہ قستالیہ سے بگڑ کر عہد و پیمانِ دوستی کو توڑ دیتا اور مسیحی علاقوں پر تاخت کر جاتا تھا۔ کبھی کبھی شمالی افریقہ کے منچلے آفاقی شہر میں مہمان بنائے جاتے، اور عیسائیوں کے خلاف کسی بڑے جہاد کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔

فردیناند اور ازابلا کی نظر میں کافروں کا اس طرح اندر گھسا رہنا خار کی طرح کھٹکتا تھا۔ اُنھوں نے غرناطہ کی بیخ کنی کا پختہ ارادہ کر لیا۔ جنگ کی تیاریاں کیں۔ مذہبی معتقد اور پادریوں نے زور شور سے تقریریں کیں۔ لوگوں میں اس مہم نے صلیبی جنگ

کا پیرایہ اختیار کر لیا۔ کئی سال کی تیاری کے بعد آخر ۱۴۹۱ء میں فردیناند پچاس ہزار کا لشکر جرار لے کر چڑھا اور شہر کو گھیر لیا۔ خود ازابلا لشکر کے پیچھے بال بچے لے کر آئی اور ایک گاؤں میں مقیم ہوئی جہاں اُس کے لیے پتھر کے نیچے نیچے مکان غرناطہ کی فصیل کے سامنے بنائے گئے تھے اور اس احاطے کا اس نے "سانتانے" (دین مقدس) نام رکھا تھا۔ وہ یہاں مہینوں مقیم رہی اور اس مدت میں مور فوجوں کو جو لڑنے کے لیے شہر سے باہر آتیں فردی ناند کا لشکر بھگاتا رہا۔ آس پاس کے علاقے کو مسیحی لشکر نے بالکل اُجاڑ دیا اور رسد رسانی کے ذرائع مسدود کر دیے۔ ازابلا خود میدان میں زرہ پہن کر نکل آیا کرتی تھی۔ اُس کی یہ زرہ ابھی تک میڈرڈ کے شاہی اسلحہ خانے میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ایک مرتبہ کسی مسلمان مجاہد کی تلوار سے بال بال بچی اور ایک دفعہ الحمرا دیکھنے کے شوق میں قریب تھا کہ دشمن کے ہاتھ میں گرفتار ہو جائے۔ ہوا یہ کہ وہ ایک قریبی گاؤں میں ایک مکان کی چھت پر چڑھی کہ اس عجائبِ روزگار قصر کا نظارہ کرے۔ اتنے میں مور سواروں کے ایک دستے نے مکان کو آ گھیرا اور اندر گھسنے والے تھے کہ مسیحی رسالہ عین وقت پر پہنچ گیا اور انھیں پسپا کر دیا۔

مہینوں محصور رہنے کے بعد بھوکے غرناطہ کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ جنوری ۱۴۹۲ء میں فردیناند اور ازابلا شہر میں بڑی شان سے داخل ہوئے تو چاندی کی ایک صلیب قصر الحمرا پر بلند کی گئی۔ پلے یو نے ۷۱۸ء میں کوادونگا پر جس جد و جہد کا آغاز کیا تھا وہ ۷۷۴ برس بعد غرناطہ میں اختتام پر پہنچی۔

باب پنجم

فاتحینِ امریکہ

غرناطہ کے تین مہینے بعد فردیناند اور ازابلا نے یہودیوں کو سپین سے نکال دیا۔ قول تھا کہ یہ دفع ہو جائیں گے تو قوم زیادہ محفوظ و متحد رہے گی۔ وہ ڈرتے یہودی ناراض ہوئے تو ممکن ہے پھر شمالی افریقہ کے موروں سے سازباز کریں حصہ میں کرلیا تھا اور دوبارہ سپین پر حملہ ہو جائے۔ ان کا دولت و مال سب چھین اور وہ ملک بدر کر دیے گئے تو بحر متوسط کے افریقی سواحل پر جہاں تہاں جا بسے نچہ ان کی اولاد آج بھی اپنے سپین کے دور پر فخر کرتی ہے۔ لیکن فتح غرناطہ اور کی جلاوطنی سے بھی بڑھ کر دنیا کے لیے تاریخ سپین کا اہم واقعہ جو اسی سال ظہور آیا وہ یہ تھا کہ ۱۲؍اکتوبر ۱۴۹۲ء کو کرسٹوفر کولمبس نے نئی دنیا دریافت کی۔

س کا خیال تھا کہ مغرب میں بحری سفر سے وہ مشرق اقصیٰ یعنی ایشیا کا بحری راستہ در کر سکتا ہے اور ازابلا بھی اس نظریے سے دلچسپی رکھتی تھی لیکن کئی سال جنگ غرناطہ کدیوں میں سارا روپیہ خرچ ہوتا رہا اور وہ کولمبس کی کوئی مدد نہ کر سکی۔ فتح کے بعد ا خیال آیا تو اپریل ۱۴۹۲ء میں اُسی سنتافے کے قیام میں اُس نے ایک اقرار نامے خط کیے اور کولمبس کو بحری سفر کی اجازت دی۔ اس کے پاس نقد روپیہ نہ تھا مگر یہ یت کہ اپنے زیور بیچ دیے درست نہیں۔ بجائے اس کے ازابلا نے ساحلی قصبے پالوس م دیا کہ وہاں کے لوگوں کے بعض جرائم کی سزا میں اہلِ قصبہ دو بادبانی جہاز تیار ے کولمبس کے حوالے کریں۔ (اس جرمانے پر اہلِ قصبہ نے خاصا واویلا مچایا تھا) ایک

اور جہاز پالوس کے رہنے والے دو بھائی مارٹن اور وی سینٹ پن زون نے فراہم کیا تھا۔

قصبۂ پالوس، اشبیلیہ سے پچاس میل جنوب مغرب میں واقع ہے اب وہاں تک ایک اچھی سڑک کھیتوں اور باغوں میں سے ہوتی ہوئی جاتی ہے۔ آپ جاکر دیکھیں تو یہ مچھیروں کی چھوٹی سی بستی ہے جسے کوئی نہیں پوچھتا۔ کولمبس وقت سے اب تک بہت کم تبدیلی ہوئی ہے۔ اگرچہ بوسیدہ ہوگیا لیکن سان جورج کا گرجا اور وہ لوہے کا منبر ابھی سلامت ہے جہاں سے بحری سفر کی شاہی اجازت اگست ۱۴۹۲ء کو علی الصباح پڑھ کر سنائی گئی تھی۔ کولمبس اور اس کے جہازی ساتھیوں نے یہ نماز ادا کی جس کے بعد مہینوں تک انھیں خشکی دیکھنی نہ تھی۔ بعد نماز یہ جلوس لیے قطار باندھ کر بستی سے گزرے اور ساحل پر آئے جہاں تین جہاز لنگر سے بندھے کھڑے تھے۔ ان کی روانگی کے وقت لوگوں کے اژدہام اور جوش وخروش آپ خود ہی تصور کریں کہ کیا عالم ہوگا۔

اس پہلے ورائے اوقیانوس سفر کی مشکلات اور خطرات کتابوں میں لکھے ہیں۔ لہذا جب یہ جہازی ۱۲ر اکتوبر کو بہاماس کے ایک چھوٹے جزیرے پر اترے ان کی مسرت بیان سے باہر ہے۔ کولمبس نے نئی سرزمین کا نام "سان سلوادور" تجویز کیا اور ملکہ ازابلا کے نام سے اس پر قبضہ کیا۔ اسے سان گمان تک نہ تھا کہ وہ دو وسیع برِّ ہائے اعظم کی نواح میں پہنچ گیا ہے۔ اپنے چوتھے سفر میں وہ خاص جنوبی امریکہ پہنچ گیا لیکن اس پر بھی نہیں سمجھ سکا کہ اس نے ایک نئی دنیا ڈھونڈ نکالی ہے۔ مرتے دم تک اسے یہی یقین رہا کہ اس نے ہندوستان کو پا لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سترہویں صدی تک سپین والے شمالی، جنوبی امریکہ اور ان کے جزائر کو "انڈیز" (یعنی ہند) کے عمومی نام سے یاد کرتے تھے۔

قانونی طور پر یہ نو دریافت ملک ازابلا اور حکومتِ قسطالیہ کی ملکیت تھے۔ فردیناڈ کا اس میں کوئی حصہ نہ تھا۔ کیونکہ نہ اس نے کولمبس کی بات کو باور کیا نہ کوئی مدد دی۔ پہلے سفر کے موقع پر کچھ روپیہ قرض دیا بھی تو اس شرط پر کہ سیاحت کامیاب ہو یا ناکام اس کا قرضہ پائی پائی ادا کر دیا جائے گا اور کامیابی کی صورت میں قرضے سے کئی گنا زیادہ اسے ملے گا۔ نظر بر ایں کولمبس کی بحری مہمات صحیح معنی میں قسطالیہ کا کارنامہ تھا خاص فردیناند کی قیطلونی یا ارغونی رعایا کو کولمبس کے ساتھ جانے تک کی اجازت نہ تھی حالانکہ یہ لوگ تجربہ کار ملاح اور سپین کی بحری شہرت میں سب سے ممتاز مانے جاتے تھے۔ قسطالیہ کی یہ اجارہ داری ازابلا کے بعد بھی قائم رہی اور اس نے اپنے وصیت نامے میں صراحتہً شرط لکھی کہ صرف اس کی قسطانی رعایا "انڈیز" سے فائدہ اُٹھانے، تجارت کرنے اور وہاں بسنے کی حقدار ہو گی۔ کسی فرد خاص کے حق میں استثنا بھی کر دیا جاتا تھا، ورنہ یہ عام بندش تین سو برس تک قائم رہی۔

کولمبس اور اس کے ساتھی مارچ ۱۴۹۳ء میں واپس آئے تو اُن کی سرگذشت سن کر اہلِ وطن کے دل میں نئے نئے ولولے پیدا ہوئے۔ ملک میں امن و امان ہونے کی وجہ سے یہ لوگ جو مدت سے کشمکش اور خطرات میں زندگی بسر کرنے کے عادی تھے سکون سے اُکتا گئے تھے۔ انھیں حوصلے نکالنے کا یہ نیا موقع ملا تو بہت خوش ہوئے۔ سمندر پار زر و جواہر کے انباروں کے خواب دیکھنے لگے اور نئی دنیا کے دلیسیوں میں مسیحیت پھیلانے کے بہت مشتاق اور آرزومند ہو گئے۔ چنانچہ ہر قسم اور عمر کے لوگ جوق در جوق بحری مہمات میں شریک ہونے لگے۔ جو "انڈیز" جانے کے لیے منظم کی جاتی تھیں۔ ملاح، پیشہ ور سپاہی، سوداگر، زمیندار، علما، امرا، پادری اور انھی کے ساتھ جوٹے، بدمعاش، غرض ہر طرح کے آدمی چل پڑے کہ امریکہ کے نو دریافت ممالک اور جزائر (غرب الہند) میں جا کر دولت سمیٹیں اور دلیسیوں کو عیسائی بنائیں۔

وہ میکسکو، ولایات متحدہ کے سواحل، وسط امریکہ اور جنوبی امریکہ کے اکثر اقطاع میں پہنچے اور طرح طرح کی قسمت سے دوچار ہوئے۔ بعض دلدلوں اور جنگلوں میں وبائی امراض یا زہر بجھے تیروں کا شکار ہوئے۔ بعض کو نہایت زرخیز اراضی کی ملکیت مل گئی، اور انھوں نے بڑے بڑے محل اور نوآبادیاں تیار کرلیں اور بہت سے وہ تھے جو واقعی زر و جواہر کی ڈھیریاں لے کر وطن واپس آئے اور سپین میں قصر اور قلعے بنا کے شاہانہ ٹھاٹ سے رہنے لگے۔ اشبیلیہ کے محافظ خانے میں "انڈیز" پر بہت سی شوخ و شگفتہ تحریریں ان لوگوں کی لکھی ہوئی محفوظ ہیں۔ نئے انکشافات، فتوحات اور نوآبادیوں کے متعلق قلمی دستاویزوں کا یہ شاندار کتب خانہ کولمبس کے فرزند فرآندو نے فراہم کیا اور قوم کے نام وقف کردیا تھا۔ ان زرد رنگ کے مراسلات اور سفرناموں میں دلیری کے عجیب عجیب کارنامے مرقوم ہیں اور وہ قدیم رنگین نقشے منسلک کیے گئے ہیں، جن کے ایک ایک میل پر حوصلہ مند سیاحوں کو سو سو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ لوگ جنھوں نے نئی دنیا کے کوہ و بیابان کھنگالے، بڑے بڑے جنگلوں کو پار کیا دور دراز چوکیوں میں بیٹھ کر یہ روداد یں لکھیں اور نقشے بنائے۔ اگر تاریخ میں کشور کشا اور فاتحین ("Conguistadore") کہلائے تو یہ کچھ غلط اور حیرت کی بات نہ تھی۔ اس سپینی لفظ کے سیدھے سادے معنی فاتح کے ہیں لیکن سپین کے یہ قسمت آزما سیاح اسے امارت کے شاہی خطاب کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ بے شبہ ان میں اکثر نہایت ظالم، سفاک اور دغاباز تھے اور جلد سے جلد روپیہ سمیٹنے کی ہوس میں مبتلا تھے۔ بایں ہمہ ان کے عزم و ہمت کے کارناموں کی چمک ہماری آنکھیں خیرہ کرتی اور ان کے جرائم کو چھپا دیتی ہے۔

اپنی تحریروں میں وہ ہمیں جیتے جاگتے نظر آتے ہیں۔ ان میں بلبوآ کے الفاظ "اگلا سمندر" ہمیں ملتے ہیں، جس کی تلاش میں وہ آگے جا رہا ہے۔ یہ لفظ اُس وقت

لکھے گئے، جب کہ تھوڑی دیر بعد اس نے خاکنائے پانامہ کو عبور کیا اور فی الواقع بحرالکاہل پر پہنچ گیا ——— سپین کے خوک پرور (= سؤر چرانے والے) فرانسسکو پزارو کے خطوط بھی اب تک محفوظ ہیں، جس نے پیرو کی زرنگار "انڈین" (یعنی دیسی امریکی) سلطنت اِنکہ (Inca) پر قبضہ جمایا اور وہاں کے سونے اور جواہرات کی ندیاں بہاکر سپین میں اُلٹ دیں — پھر پونسہ دِلیون کی داستان لکھی ہوئی ملتی ہے جو "چشمہٗ شباب" کی تلاش میں نکلا اور اس کی بجائے فلوریڈا کی سرزمین دریافت کی۔ یہ اطلاعات پرتگیز جہازراں ماگلاں (Magellan) نے بھیجی تھیں جو پانچ سپینی جہازوں کا بیڑا اپنی قیادت میں لے کر ۱۵۱۹ء میں روانہ ہوا اور دو سال بعد فلپین جزائر کو ڈھونڈ نکالنے کی خبر دی۔ وہ خود انھی جزائر میں مارا گیا مگر اس کے چھوٹے سے بیڑے کا ایک جہازی باسک ناخدا (سباستین دل کالز) کے زیر ہدایت آگے بڑھے گیا اور پورے کرۂ ارض کا چکر لگایا۔

ان سپینی فاتحین کے عہد میں طرح طرح کے افسانے اور عشق و شجاعت کی داستانیں کثرت سے تصنیف ہوئیں لیکن گردآلود پرانی دستاویزوں میں جو واقعات لکھے ہیں وہ ان خیالی قصوں سے بڑھ کر حیرت افزا ہیں۔ ان میں بانکوں، بہادروں، شہسواروں کے لمبے لمبے نام آتے ہیں، جو اپنے زمانے کے "فوق الانسان" مانے جاتے تھے۔ جنھوں نے دُور دُور جاکر اژدہوں، دیوزادوں کو مارا، طلسماتی قلعے فتح کیے مسحور و مقید حسین عورتوں کو مصیبت سے چھڑایا اور اس طرح کے دنگ کردینے والے کام انجام دیے۔ معلوم ہوتا ہے، لکھنے والوں کو مصالحہ تو سیاحوں اور آبادکاروں کی روایات میں مل جاتا تھا، مگر وہ دیو پری کے پرانے افسانوں ہی کو ردّوبدل کے ساتھ بیان کرنا پسند کرتے تھے۔ بایں ہمہ کوئی پرانی داستان بھی ہوش رُبا جاں بازی کے بیان میں کورتِس کی فتح میکسکو کی اصلی سرگزشت سے بڑھی ہوئی نہ نکلے گی۔

یہ ہسپانوی قسمت آزما، ہرنان کورتیس (Hernan Cortes) اپنی کیوبا کی اراضی میں رہا کرتا تھا۔ جب اسے ایک اکتشافی مہم لے جانے کے لیے انتخاب کیا گیا۔ انہی دنوں خلیج میکسیکو کے پار مغرب میں نئے علاقے کا پتا چلا تھا اور یہ مہم اس کی تفتیش کے لیے تیار کی گئی تھی۔ کورتیس نے اس کام پر اپنے مستقبل کی بازی لگا دی اور مصارف کے لیے اپنی کیوبا کی زمینیں گرو کر دیں۔ مہم کے ساز و سامان میں اس نے دو جھنڈے بھی بنوائے تھے جن پر سونے کے حروف سے یہ نعرہ لکھا ہوا تھا: "بھائیو، ساتھیو، سچے اعتقاد سے مقدس صلیب کے نشان پر بڑھو اور اسی کی برکت سے ملک فتح کرو"۔ کیوبا سے جہاز میں سوار ہوا تو پانسو سے کچھ ہی زیادہ پیادے، تھوڑے سے سوار سپاہی، سو ملاح سولہ گھوڑے، چند چھوٹی توپیں، دو سو کیوبائی اور حبشی اس کے ہمراہ تھے۔ یہ دیسی اور حبشی مزدور و خدمت گار کے طور پر ساتھ لیے تھے۔ روانگی کے وقت وہ جھنڈے لہرائے گئے۔ جہاز ساحل میکسیکو پر پہنچے تو کورتس نے ان کو برباد کرا دیا کہ سامنے جو مہم تھی، اس سے پلٹنے کا کوئی امکان ہی نہ رہے۔ اس کا رفیق دیاز جس نے اس مہم کی ایک درخشاں تاریخ اپنی یادگار چھوڑی، لکھتا ہے کہ "کوئی شک نہیں کہ برکت والی بی بی (مریمؑ) اور سنتیاگو نے مدد کی اور ہمارے دلوں میں ہمت اور دلیری کی روح پھونک دی۔

ماضی پر نظر دوڑائیں تو آج بھی فتح میکسیکو ناممکن چیز نظر آتی ہے، لیکن کورتس نے وسط ملک کے حکمراں قبیلہ ازتک (Aztec) کے خلاف محکوم قبائل کے ہزاروں دیسیوں کو بہلا پھسلا کر اپنے مٹھی بھر فرنگیوں کا حلیف بنا لیا۔ وہ انھیں ساتھ لے کر بڑھا اور ازتک بادشاہ مُنتِزُما کو پکڑ لیا۔ بادشاہ کی ذات وہاں بہت مقدس مانی جاتی تھی۔ اسے یرغمال بنا کے کورتس کمال دلیری سے خاص پایۂ تخت تِنوک تِتلَن (شہر میکسیکو) میں اپنی مختصر فوج لے گیا اور اس گنجان شہر کے عین وسط میں اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔ بعد میں شہر والوں نے یہ سمجھ کر کہ مُنتِزُما جان بوجھ کر دشمن کی قید میں گیا اور وطن سے غدّاری کی، اسے سنگباری

کر کے جان سے مار ڈالا — اب کورتس اس کے رفیق بپھرے ہوئے ازتکوں کی زد میں آگئے اور جس طرح بن پڑے شہر سے ناگزیر ہوگیا۔ چنانچہ رات کی آڑ میں وہ شہر سے چلا کہ دن نکلتے نکلتے کھلے میدان میں پہنچ جاگا لیکن جب یہ لوگ ایک لمبی اور پتلی بلند سڑک پر آئے جو شہر سے دیہات میں نکلتی تو حریف نے انھیں آلیا اور ایسی خونخواری سے حملے کیے کہ آدھے سپینی اور اُن کے ہزاروں ہی اتحادی مارے گئے۔ تاریخ میں یہ رات "Nochetriste" یعنی شبِ غم کہلاتی ہے۔ بچ نکلنے والوں میں کورتس بھی تھا۔ اس نے معرکے سے نجات پاتے ہی اپنے بے خود اب زخمی سپاہیوں کو فوراً پھر جمع کیا اور تعاقب کرنے والوں پر اس طرح جا پڑا کہ ہر چند یہ ناقابلِ یقین معلوم ہوتی ہے لیکن یہیں سپین والوں نے وہ فیصلہ کن فتح حاصل کی جس نے انھیں میکسیکو کا مالک بنا دیا۔

یہ اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں کہ ان سپینی فاتحوں کا سب سے مقدم مقصد دیسی باشندوں سے زر و جواہر لوٹنا ہوتا تھا لیکن ان کے براف سپین کے بادشاہ "انڈیز" کو فقط ذریعۂ آمدنی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کی دلی خواہش ہی کہ نئی دنیا میں نئی بستیاں بسائیں اور گو وہاں کی بے حساب دولت سے وہ اپنے خزنے بھرتے رہے، تاہم اس کے عوض اُنھوں نے امریکہ کو وہ چیزیں بھیجیں جن سے پشتہا پشت کے بعد یہاں کی دولت میں کہیں زیادہ اضافہ ہوگیا۔ وہی اسپینی جہاز جو امریکہ سے موتی، زمرد، سونا چاندی یا ان کے زیور، نفیس پروں کی مصنوعات یا پارچہ دنیز کوہستانِ انڈیز کے للاما (=شترکوہی) اور خاکنائے پانامہ کے چمکیلے پروں والے پرندے تک) بھر بھر کے قادس و اشبیلیہ کی بندرگاہوں پر لے جاتے تھے، وہاں سے بھی گھوڑے، گائیں، بکریاں، مرغیاں، سؤر اور کتے لاد لاد کر نئی دنیا کے لیے لاتے، جہاں یہ اُس وقت نایاب تھے۔ اسی طرح بہت سے پودے اور بیج نئی زمین میں بونے کے لیے بھیجے گئے۔ گنا، کپاس، قہوہ عربی ملکوں سے چل کر سپین آئے تھے اب اور آگے مغرب میں امریکہ پہنچ گئے۔ دیسی غلّوں کے

بہ پہلو پرانی دنیا کی گیہوں کی بالیں لہرانے لگا اور شراب کے لیے اعلیٰ درجے کے انگور سپین کے تاکستانوں سے منتقل ہو کر امریکہ کی کوپ میں پرورش پانے لگے۔ سپین کے آباد کار جنھیں وسیع رقبے عطا ہو گئے تھے ان کے دیسیوں سے سخت محنت لیتے اور اپنی معادن یا کھیتوں میں زبردستی مزدوری کراتے میں بڑے ظلم کرتے تھے جس کا حال ہم تحریری وقائع میں پڑھتے ہیں جزائر غرب الہند میں تو وہاں کے دیسیوں سے ایسا وحشیانہ برتاؤ کیا گیا کہ وہ نسل ہی ختم ہو گئی اور فرنگی آباد کاروں کو محنت مشقت کے کاموں کے لیے افریقی حبشیوں کو درآمد کرنا پڑا۔

ازابلا اور اس کے جانشین اس طریق عمل کے حامی یا وکیل نہیں تھے بلکہ وہ اپنے سپینی حکام کو ہدایت کرتے تھے کہ دیسی امریکیوں کے ساتھ ایسا مہربانی کا برتاؤ کریں کہ وہ خوشی سے بلا جبر و اکراہ ہمارا مقدس کیتھولک مذہب سیکھیں اور قبول کریں۔ ان بادشاہوں نے دیسی اور سپینی میں کوئی نسلی فرق بھی نہیں قائم کیا اور ایسے قوانین نافذ کیے جن سے بالآخر غلامی یا بردہ فروشی کی ممانعت ہو گئی۔ شروع میں کولمبس دیسی امریکیوں کو لے کر آیا اور بطور غلام بیچنا چاہتا تھا مگر ازابلا کے کہنے سے اس نے انھیں چھوڑ دیا۔ دیسیوں کے ساتھ سپینی حکام کی عنایت اور روا داری نے درحقیقت وہ کام کیا جس کی ہم آج پوری طرح قدر بھی نہیں سمجھتے۔ تاہم زمانۂ حاضرہ کے مؤرخین اس بارے میں متفق ہیں کہ فتوحات اور آباد کاری کے سلسلے میں ناگزیر ظلم و تعدّی کے باوجود اہلِ سپین کا سلوک یورپ کی اکثر سلطنتوں سے جنھوں نے نو آبادیوں پر قبضہ کیا زیادہ انسانیت کا تھا۔ اور اس نے دوسری فرنگی قوموں کی طرح اپنے ماتحت دیسی امریکیوں کی بیخ کنی اور بربادی نہیں کی اس کی دلیل اہل تاریخ یہ پیش کرتے ہیں کہ دوسرے فرنگی مقبوضات میں وحشیوں کو رام کرنے میں اتنے صبر و تحمل سے کہیں کام نہیں لیا گیا اور دور دور تک پھیلی ہوئی

خطرناک سرحدوں کو محفوظ رکھنے میں اس قدر کم خونریزی کہیں نہیں ہوئی جتنی سپین کے مقبوضات میں۔

کیتھولک مذہب بھی ان ایام میں نئے مقبوضات یا نو آبادیوں میں نرمی اور دانش مندی سے کام کرنے کا موید رہا۔ راہب اور پادری جو دین کی تبلیغ کے لیے امریکہ آئے فاتحین کی دست درازیوں کے مقابلے میں دیسیوں کی حمایت کرتے تھے اور ان میں تعلیم پھیلانا ضروری سمجھ کر جا بہ جا ابتدائی مکاتب بنا رہے تھے۔ آگے چل کر ان ہی مذہبی داعیوں نے دس بارہ دارالعلوم قائم کیے۔ ان ہی میں پیرو کے شہر لیما کی سان مارکوس (۱۵۵۱ء) اور میکسیکو یونیورسٹی (۱۵۵۳ء میں) قائم ہوئی۔ یہ ہمارے ولایاتِ متحدہ کے سب سے پہلے ہارورڈ کالج سے تقریباً ایک سو برس پہلے وجود میں آئیں۔ سپینی پادری تعلیم دینے کے علاوہ خود بھی دیسی شاگردوں میں مل جل کر اُن کی زبانیں سیکھتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ دیسی بولیاں سیکھے بغیر ان میں مذہب کی تبلیغ اور اشاعت نہیں ہو سکتی۔ انھی مذہبی داعیوں نے سپینی اور دیسی زبانوں کی لغات، صرف و نحو اور دینی ضروریات کی کتابیں لکھیں۔ وحشی امریکیوں کو لکھنے پڑھنے اور مسیحیت کے ضروری عقائد کی تعلیم دی، کار آمد صنعت و حرفت سکھائی اور زراعت کے بہتر طریقے سکھائے۔

مذہب کی تبلیغ اور تہذیب سکھانے کے کام میں ان لوگوں نے بڑے جوش اور دلیری کا ثبوت دیا۔ حقیقت میں بہت سے مذہبی داعی حوصلہ مندی اور قسمت آزمائی میں جنگجو فاتحین سے کسی طرح پیچھے نہیں رہے۔ ان میں خصوصیت سے دو شخص سولھویں صدی کے سپین کی ذہنیت کی نمایاں مثال پیش کرتے ہیں یعنی اگناتیس لویولا (Saint Ignatius Loyola) فرانسس زیوئر ولی (Saint Francis Xavier)

لویولا باسک قوم کا امیرزادہ تھا۔ جوانی میں بہت خوبصورت، زندہ دل، بانکا عاشق مزاج، لڑنے بھڑنے سے یا وضعدار بانکے جوانوں کی میل ملاقات سے فرصت ملتی

تو وہ بہادری کی داستانیں پڑھا کرتا تھا۔ تیس برس کی عمر تھی جب ایک معرکے میں گولہ لگنے سے دونوں پانوؤں کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور وہ سمجھا کہ ساری عمر لولا، اپاہج ہو کے رہ جائے گا۔ خود پسندی کی وجہ سے یہ بھی اُسے پسند نہ تھا کہ لنگڑا، لنجا بن کے جیسے چنانچہ ڈاکٹروں سے کہا کہ ہڈیاں توڑ کر پھر اس طرح جمائیں کہ وہ اپنے پاؤں سے چلنے کے قابل ہو جائے۔ اس میں کئی مہینے اسے زیرِ علاج رہنا پڑا مگر مطالعہ کی خوب فرصت ملی۔ شاید سوچ بچار کا وقت مل جانے سے بھی اپنی خود پسندی اور فضول مشاغل پر نظر گئی اور بہادری کی داستانیں چھوڑ کر وہ مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں منہمک ہو گیا۔ پہلے اگر کسی خوبصورت عورت کو چھڑانے یا کسی قلعے پر حملہ کرنے کے خواب دیکھتا تھا تو اب مقدس دوشیزہ مریم (علیہا السلام) کے لیے جنگ کرنے کی آرزو دل میں پیدا ہوئی اور وہی قوت متخیلہ قلعہ کشائی کی بجائے یہ منصوبے باندھنے لگی کہ انسانی عقائد کے قلعوں میں کیتھولک مذہب کا جھنڈا لہرایا جائے۔ اس نے خواب میں نیکی اور بدی کے پہلوانوں کو اپنی روح کے لیے کشتیاں کرتے بھی دیکھا۔ جب وہ دوبارہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا (اگرچہ ساری عمر لنگ کرتا رہا) تو سابقہ یار دوستوں کے جلسے جمانے کی بجائے اس نے روزے رکھے۔ کتابیں پڑھیں اور پھر کئی خواب دیکھے۔ ایک کرسمس کی شام کو کسی خانقاہ کے تسبیح خانے میں جھکا ہوا دعا کر رہا تھا کہ اسے یکایک محسوس ہوا کہ وہ مقدس دوشیزہ کے جلو میں منتظر ہے کہ صبح ہوتے اسے (دین کے میدان کا) شہسوار (یا Knight) بنا دیا جائے گا۔ اُس وقت سے زندگی کا مقصد واضح طور پر کیتھولک مذہب کے لیے جنگ کرنا ہو گیا۔ اس نے ایک نئے مذہبی فرقے کی بنیاد ڈالی جس کے ارکان حلف اُٹھاتے تھے کہ قریب قریب جنگی قسم کے شدید ضوابط کی پابندی کریں گے اور کیتھولک مذہب کی فتح کے لیے دل و جان سے جنگ کریں گے۔ یہی فرقہ "جمعیتِ عیسیٰ" یا عیسوی (Gesuit) موسوم ہوا۔ یورپ کے ہر ملک کے آدمی اس جمعیت میں شامل ہوئے اور سارے خطۂ ارض

پر دعوت وتبلیغ کے لیے جانے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ فرقہ قوی ہو گیا۔ آگے چل کر جگہ جگہ لوگوں کو اس سے نفرت اور بے اعتمادی پیدا ہوئی لیکن چونکہ وہ خالص ہسپینی نہیں رہا بلکہ بین الاقوامی قسم کا ہو گیا تھا لہذا ہمیں یہاں اس کی سرگزشت سنانے کی ضرورت نہیں البتہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ حوصلہ مندی اور فتوحات کا جذبہ (اگرچہ اس میدان میں روحوں کو فتح کرنا مقصود تھا) جو عیسوی جماعت کو ظہور میں لایا، ہسپین اور ہسپین کے بھی عہد شجاعت کی خصوصیات ہی کا نمونہ تھے۔

دوسرا شخص فرانسس زیویر بھی باسک قوم کا امیر زادہ اور عیسوی تھا۔ جسے ہندوستان اور مشرقِ اقصیٰ میں مسیحیت کی تبلیغ کے لیے چنا گیا۔ ہندوستان کے جنوبی سرے پر ہم اسے دس ہزار بت پرستوں کو بپتسمہ دیتے ہوئے سنتے ہیں۔ مغربی ساحل پر بہ مقام گوآ تعلیم و تبلیغ کے لیے مدارس اور گرجے بناتے، بیماروں کی خدمت کرتے دیکھتے ہیں۔ پھر وہ مصالحے کے جزیروں میں گیا اور تین سال بعد بحرالکاہل کے جنوب سے، شمال میں جاپان، پہلا مسیحی داعی بن کر پہنچا اور تین سال گزار کر چین کو روانہ ہوا تھا لیکن راستے میں فوت ہو گیا۔ لاش دفن کرنے کے لیے گوآ لائی گئی جو اس کے قدیم وطن یعنی شمالی ہسپین کے ایک قلعے سے جہاں وہ پیدا ہوا ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

باب ششم

چمک دمک کا زمانہ ہیپس برگ خاندان

جن دنوں اہلِ سپین امریکہ کے دونوں براعظم چھان رہے تھے اور نوآبادیاں بنا رہے تھے سپین کا علاقہ یورپ میں بھی وسیع ہوتا رہا۔ شاہ فردیناند نے لڑکر جنوبی اطالیہ کی ریاست نیپلز، نیز بحر متوسط کے جزیرے صقلیہ اور ساردینیہ فتح کر لیے۔ جزیرہ نما میں (پرتگال کو چھوڑ کر) صرف ریاست نوار خود مختار رہ گئی تھی۔ ازابلا کی وفات کے بعد اسے بھی وہاں کی شہزادی سے شادی کرکے حاصل کر لیا۔ یہ شہزادی جس کا خوبصورت نام "جرمینہ دِ فوآ" تھا، نوار کی ولیۂ عہد تھی۔ ۱۵۱۶ء میں فردیناند فوت ہوا تو، قستالیہ، ارغونہ اور اس کے جملہ مقبوضات سولہ سال کے نوجوان چارلس کے ورثے میں آئے۔ وہ فردیناند اور ازابلا کا نواسہ تھا۔ ان کا بیٹا بہت پہلے نوجوان مرگیا تھا ذہین اور نیک ہونے کے علاوہ، اس کی جواں مرگی اس لیے بھی قوم کی بڑی بدنصیبی تھی کہ مرنے والے کی بہن جُوآنا وارثِ تخت وتاج رہ گئی۔ وہ دیوانی تھی۔ چنانچہ اس کا آسٹروی شوہر شہزادہ فلپ "خوبرو" فوت ہوا تو اُس نے ضد کی کہ مردہ جسد برابر اس کے پاس رہے اور دفن کرنے کی اجازت نہ دی۔ باپ نے اسے محض بیکار سمجھ کر ایک خانقاہ میں بند کرادیا اور اس کے فرزند چارلس کے ولی عہد سلطنت ہونے کا اعلان کردیا تھا، لیکن خوش ہونے کے بجائے سپین والے نئے بادشاہ سے سخت ناراض ہوئے کیونکہ وہ آسٹریہ کے ہیپس برگ بادشاہ (میکس لی لیان) کا پوتا اور اُن کی نظر میں غیر ملکی آدمی تھا۔ چارلس کو اپنے باپ شہزادہ فلپ کی طرف سے دادا کی عظیم سلطنت (یعنی آسٹریہ، جرمانیہ کے اقطاع اور نیدرلینڈز) جو ہیپس برگ خاندان کے کیتھولک بادشاہوں کے قبضے میں تھی، ورثے میں ملی۔ لیکن اس کو بھی سپینی رعایا خاطر میں نہ لائی۔ ان کے نزدیک وہ ان کی

قوم میں پیدا نہیں ہوا، لہٰذا گھٹیا درجے کا آدمی تھا۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کی پرورش سپین میں نہیں ہوئی تھی اور اوائل عہد حکومت میں وہ سپینی زبان بھی اچھی طرح نہ بول سکتا تھا۔ اہلِ سپین خیال کرتے تھے کہ ان کوتاہیوں کی وہ کوئی تلافی نہیں کر سکتا تھا۔

اُدھر خود چارلس کو اپنے سپینی مقبوضات سے کچھ بہت دلچسپی نہ تھی۔ اول اول اس نے سپین آکے رہنے کا بھی ارادہ نہیں کیا بلکہ آسٹریہ اور فلینڈرس (جو قریباً موجودہ بلجیئم اور شمالی مشرقی فرانس پر مشتمل علاقہ تھا) ہی میں رہا اور ساز باز کرتا رہا کہ دادا کی جگہ "مقدس سلطنتِ رومہ" کا شہنشاہ بھی خود کو منتخب کرائے۔ جس طرح شیوخِ کلیسا کارڈنیال اپنے امام یا پاپائے رومہ کا انتخاب کیا کرتے تھے۔ اسی طرح ملوکِ یورپ اُن دنوں اپنے گروہ سے ایک فرد کو منتخب کرتے جسے "شہنشاہ" کا خطاب اور ان بادشاہوں پر بالادستی کا حق حاصل ہوتا تھا۔ ۱۵۱۹ء میں چارلس واقعی شہنشاہ منتخب ہوگیا اور چونکہ مقدس سلطنتِ رومہ کے شہنشاہوں میں وہ پانچواں چارلس تھا لہٰذا تاریخ میں چارلس پنجم ہی مشہور ہے حالانکہ سپین میں اس نام کا وہ پہلا شاہ چارلس تھا۔ مگر سپین والے بھی اسے "چارلس پنجم" ہی کہتے تھے۔

انتخاب شہنشاہی کے لیے تگ و دو کرنے کے زمانے میں چارلس نے آسٹروی اور فلیمی (یعنی فلینڈرسی) امرار حکومت کے لیے سپین بھیج دیے تھے۔ ان غیر ملکی حاکموں کے آنے سے اہل سپین کو بہت غصہ آیا اور وہ ان محصولات پر بھی بہت بگڑے جو ان کا بادشاہ سپین سے وصول کرتا اور بیرونی ممالک میں خرچ کرتا تھا۔ پھر فلیمی سپاہی سپین بھیجے گئے اور انھیں لوگوں کے گھروں میں اتارا گیا تو وہ اور زیادہ ناراض ہوئے۔ ان فلیمی سپاہیوں کا طرزِ عمل خراب تھا جس کا اندازہ ہم اس طرح کر سکتے ہیں کہ چارلس ہی کے زمانے میں سپینی لفظ "فلیمنکو" (اصلاً بمعنی فلیمی) بے شرم اور گنوار کے معنی میں بولا جانے لگا تھا۔ یہ سب خرابیاں اور ناگواریاں آخر کو رنگ لائیں اور شمالی اور وسطی سپین خصوصاً قستالیہ میں بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ یہ سنگین شورش "کومونروس" کہلاتی ہے جس کے معنی شہریوں کی سرکشی ہیں، کیونکہ درحقیقت زیادہ تر بڑے شہروں ہی کے باشندے تھے، جنھوں نے اپنے بادشاہ کی حکومت کے

خلاف ہتھیار اُٹھائے، لڑائی کے مصائب جھیلے اور بغاوت فرو ہونے کے بعد الغی کے سرگروہوں کو قتل کی سزا دی گئی۔ انھوں نے یہ سزا بہادر محبان وطن کی طرح برداشت کی۔ ان میں سے ایک شخص جُوآن برے دونے پھانسی پر چڑھتے وقت پکار کر کہا "ہم غدّار نہیں ہیں بلکہ آزادی وطن کے حامی اور محافظ ہیں۔"

اس تباہ کن شہری بغاوت کا الزام چارلس کی جوانی اور ناتجربہ کاری ہی کو دینا چاہیے وہ سپین کے مزاج یعنی وہاں کے لوگوں کی خود پسندی اور آزادہ روی سے واقف نہ تھا اور اس قومی جذبے کی کہ مقامی لوگ حکومت کریں، اس نے پروا نہ کی۔ سپین میں صرف امیر امرا ہی نہیں، معمولی سے معمولی باشندہ بھی غرورِ آزادی رکھتا ہے۔ وہ رئیس اور امیر کبیر ہو یا صدر کلیسا ہو یا محض کسان یا گداگر کیوں نہ ہو، عزتِ نفس ان کی فطرت میں داخل ہے۔ ہسپانوی ہونا ہی اُن کے نزدیک یہ حق رکھتا ہے کہ دوسرے ان کا پاس و لحاظ کریں۔ پھر وہاں کا ہر شخص سمجھتا ہے کہ دوسرے کے متعلق خواہ وہ کوئی ہو، رائے ظاہر کرنے کا حق حاصل ہے۔ سِد کا قصہ آپ کو یاد ہوگا کہ بادشاہ تک سے لڑ پڑا اور پاپائے روما کی اہانت کرنے سے نہ جھجکا۔ اس کی یہی بیباکیاں سپین والوں کو دل سے پسند آتی تھیں۔ سپین کے امیروں کو اجازت تھی کہ بادشاہ کے سامنے بھی (تعظیماً) ٹوپی نہ اتاریں۔ اہل قشتالیہ کا قول تھا کہ "ہم بادشاہ کے ہمسر ہیں البتہ اس کے برابر مال دار نہیں ہیں" ارغونہ والوں نے اپنے بادشاہ کو ایک دفعہ لکھا تھا کہ "ہم میں سے ہر شخص تم جیسا ہے اور ہم مل کر تم سے بہتر ہیں۔" اپنے سپاہیوں کی نسبت فردی ناند اعتراف کرتا تھا کہ بہت اچھے سپاہی ہیں لیکن واقع میں ایسے نافرمان ہیں کہ کسی سپہ سالار کا انھیں قابو میں رکھنا قریب قریب ناممکن ہے۔

عمر و تجربہ بڑھنے کے ساتھ چارلس اپنی سپینی رعایا کے ساتھ زیادہ اچھی طرح گزر بسر کرنا سیکھ گیا ان کی طرف سے بے پروائی بھی جاتی رہی اور جب محاربات سے فرصت ملتی تو سپین میں وقت گزارنا پسند کرتا تھا۔ یہاں وہ ہر طرف دورے کرتا، نئی عمارات بنواتا، پرانی عمارتوں کی تجدید و ترمیم کراتا، مذہبی کرتبوں میں شریک اور صدر ہوتا، دنگل میں سانڈ لڑاتا اور اپنی قلمی تصویریں کھنچواتا۔ اس کی مقناطیسی شخصیت

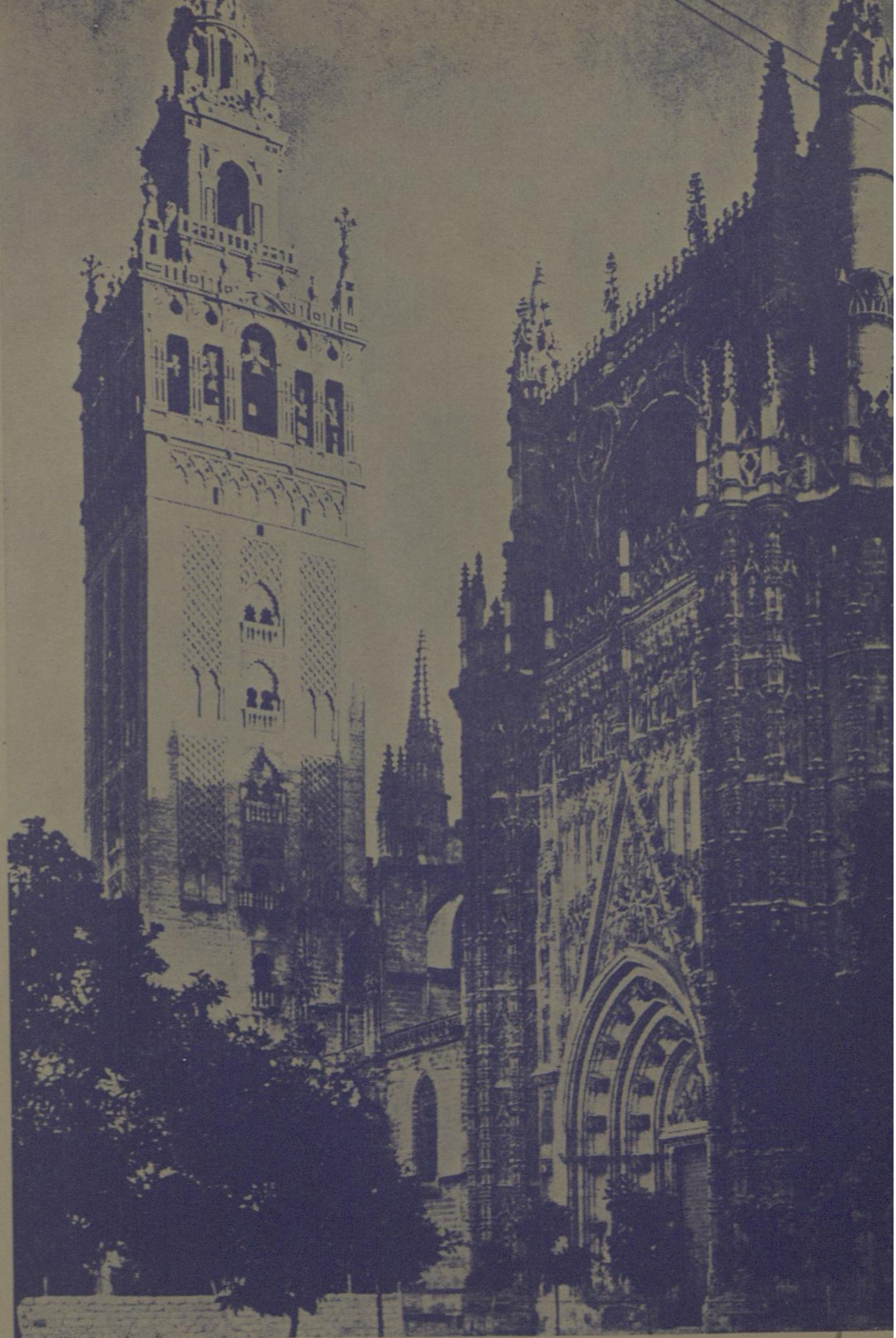
کے اثرات ابھی تک باقی ہیں۔ میڈرڈ، طلیطلہ، غرناطہ، اشبیلیہ جہاں آپ جائیں لوگ اس کی تعمیرات آپ کو دکھائیں گے اور بیان کریں گے کہ وہ کہاں کہاں مقیم رہا اور کیا کہتا اور کیا کرتا تھا۔ ان حکایتوں میں آپ کو اس کی شاہانہ تمکنت اور سلطنت کی آب و تاب کا احساس ہوگا۔ بہر حال آپ اس کے بیرونی محاربات اور جنگی کارنامے نہیں گے کیونکہ جنگ اس کا دل پسند مشغلہ تھا جس میں تمام زندگی وہ مصروف رہا۔ اطالیہ پر چار جنگیں فرانس سے لڑیں جہاں فریقین اپنا اثر جمانے کی جدوجہد کرتے رہے۔ شمالی افریقہ کے مور غارت گروں سے جنگ کی جو سپین کے ساحلوں پر آپڑتے اور سپینی جہازوں کو پکڑے جاتے تھے۔ چارلس نے ۲۰ ہزار مسیحی جو موروں کی غلامی میں پڑے تھے آزاد کرائے۔ اس کے اوائل عہد میں ایک دفعہ اس کی فوج نے جو ضبط و نظم سے عاری تھی اطالیہ میں شہر رومہ پر قبضہ کر کے لوٹ لیا جیسے کوئی دشمن شہر ہوتا ہے۔ حالانکہ رومہ دشمن شہر نہ تھا۔ اس کے اوائل عہد ہی میں مارتن لوتھر نے پاپائے رومہ اور کیتھولک مذہب سے انحراف کیا اور بہت سی جرمن ریاستیں اور وہاں کے باشندے لوتھر کے جدید مذہب کے پیرو ہو گئے۔ ۲۰ برس بعد چارلس نے ان ریاستوں کے جتھے پر حملہ کیا اور مذہبی محاربات کا وہ سلسلہ شروع کیا جس نے اہل سپین کے دلوں میں اُن جذبات کی جگہ لے لی جو پہلے موروں سے طول طویل جنگوں اور یہودیوں سے قدیم نفرت و عناد کے باعث پیدا ہوا کرتے تھے۔

پُر مشقت و فکر زندگی نے چارلس کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا۔ پچپن سال کی عمر میں اسے احساس ہوا کہ وہ زیادہ نہیں جیے گا۔ لہذا اپنے فرزند ولی عہد فلپ دوم کے حق میں تخت سے دست بردار ہو گیا۔ یوستے کی خانقاہ میں جا رہا جو میڈرڈ سے سو میل کے فاصلے پر تھی۔ یہاں زندگی کے آخری دو سال اس نے شاہانہ شان و شوکت سے گزارے کہ خدم و حشم اور درباریوں کا لشکر اسے گھیرے رہتا تھا۔

فلپ دوم میں باپ کی سی دل کشی اور مستعدی نہ تھی لیکن سپین میں وہ چارلس سے



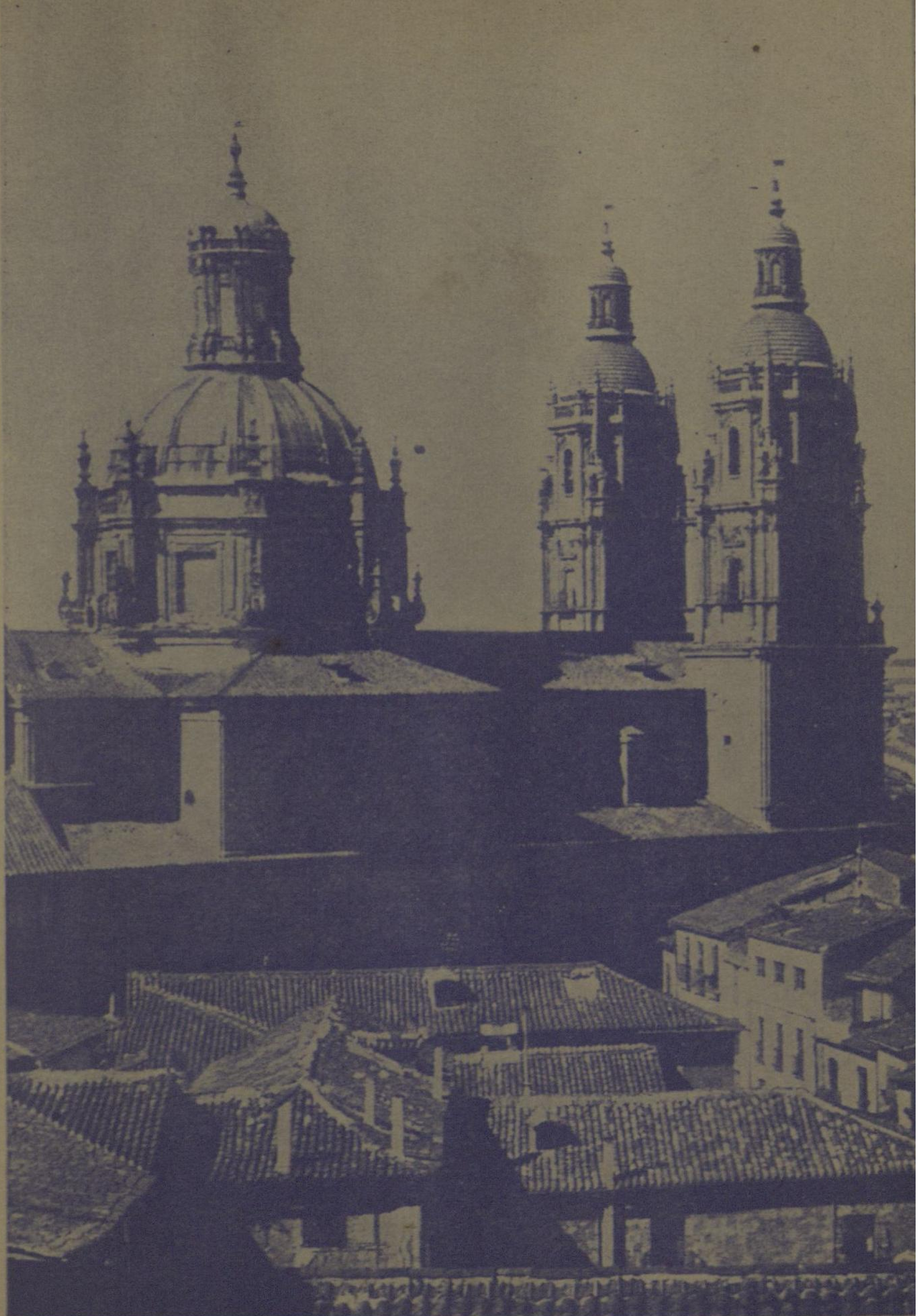
مالقہ میں عربی طرز کا ایک باغ



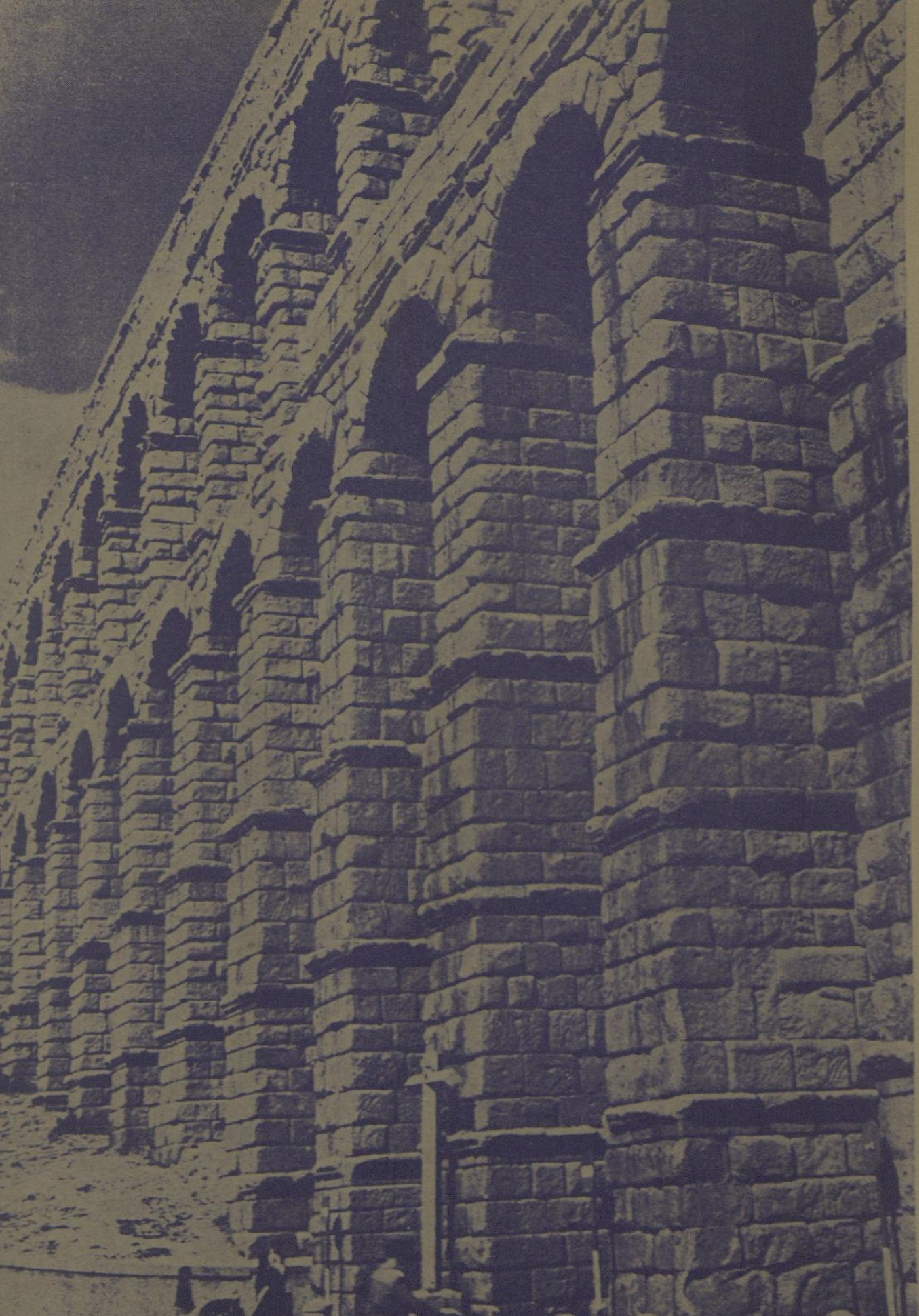
کلیسائے اشبیلیہ میں لاجِرالڈہ کا مینار



بھیڑیں پالنا اور اُونی کپڑا بُننا پُرانے قشتالیہ کے خاص پیشے ہیں



شہر سلمنکہ کا بڑا گرجا گھر



اہل رُومہ کا پُختہ تالاب شقوبیہ میں



قشتالیہ جدید میں جدراق کے قریب ایک میدانی منظر



سیڈرڈ میں شارع القلعہ کا ایک منظر



عہد احیائے علوم کا طرزِ تعمیر۔ کلیسائے سنتیاگو کا



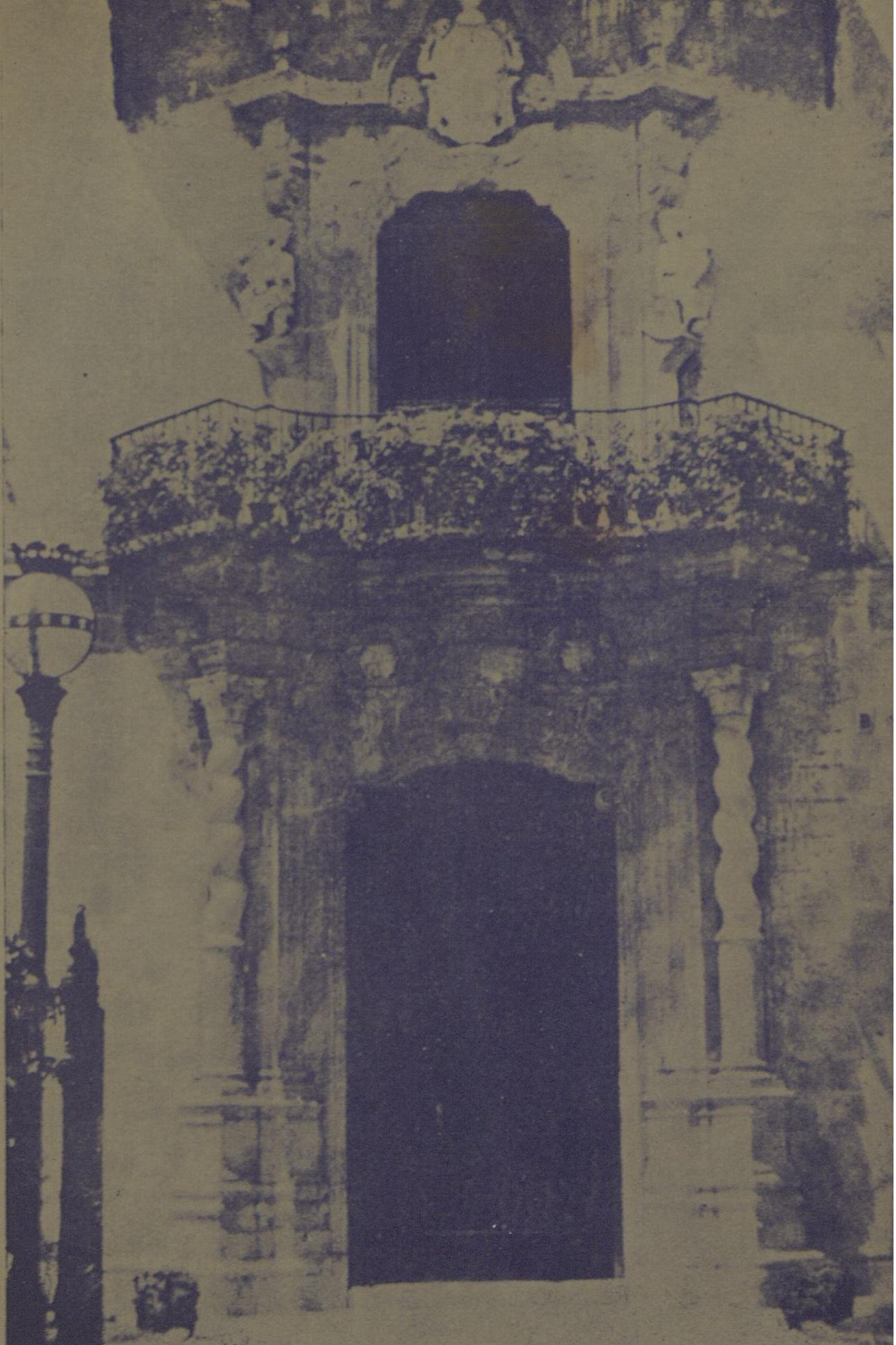
شہر ولیہ میں بیلوں کی نسل کشی کا فارم



جلیقیہ میں مچھیروں کا ایک گاؤں
ایک درگاہ کی چھت پر تربوز پکائے جا رہے ہیں



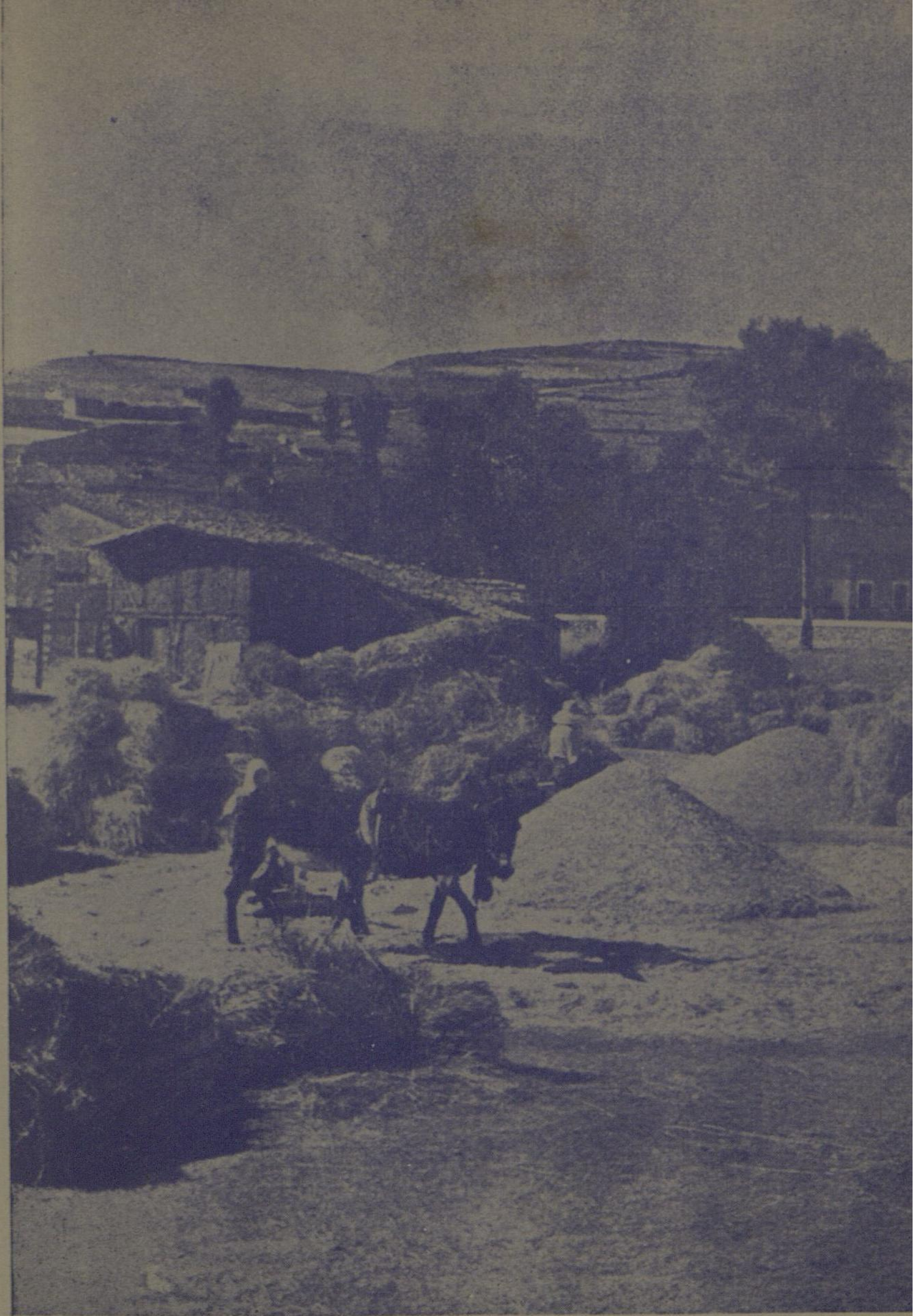
سان تندر کے قریب جبلُ البرانس کی چوٹیاں



شہر نیش کے ایک مکان کی دو منزلہ ڈیوڑھی پر خاندانی ڈھال



جلیقیہ میں بندرگاہ ویگو



بورغش کے ایک کھیت میں گاہنے کا قدیم طریقہ ابھی تک جاری ہے



اشبیلیہ کے اپریل کے میلے میں نوجوان مرد و زن کی آمد



اُرنسہ جلیقیہ کا ایک کوُچہ

زیادہ ہر دلعزیز رہا جس کا سبب شاید یہ تھا کہ وہ سپین میں پیدا ہوا۔ وہ کھرا، بے ذوق سا، مذہبی آدمی تھا۔ اس کی تعریف کرنے والے کہتے ہیں کہ وہ ضمیر کے مطابق کام کرتا تھا اور سپین کی عزت وعظمت اور وہاں کے کیتھولک مذہب کی ناموری ہمیشہ اس کا مقصد رہی۔ ان الفاظ کے جو معنی بھی وہ سمجھتا ہو — مگر کتابوں سے بڑھ کر اس کی سیرت کا پتا اسکوریال کی سیر کرنے سے چلتا ہے۔ یہ وہ ٹھنڈی، وسیع، قلعہ نما عمارت ہے جسے میڈرڈ کے شمال مغرب میں کوئی تیس میل کے فاصلے پر اس نے دامن کوہ میں تعمیر کیا تھا۔ رہنے کا محل۔ عبادت خانہ اور ایک عجائب گھر اس میں شامل تھے۔ ممکن ہے ایسی لق ودق عمارت کو بھی اس نے سپین کی عظمت وشان کے شایاں سمجھا ہو جس کے اندر سو میل سے زیادہ لمبی غلام گردشیں، ۸۶ زینے، تین نماز خانے، پندرہ کھلے صحن کے صومعے اور ہزاروں کھڑکیاں بنی ہوئی ہیں، جہاں سے قستالیہ کے بل کھاتے ہوئے بھوئے بھوئے بلند میدان زیر نظر آجاتے ہیں (بعض صاحبوں نے اس قصر کو بھی دنیا کے ہفت عجائبات کے بعد آٹھواں شمار کیا ہے)

شاہی شان شوکت دکھانے کے شوق کے باوجود، فلپ کا شخصی ذوق سادہ تھا۔ اسکوریال میں اس کے اپنے کمروں سے تقویٰ اور خشک مزاجی ٹپکتی ہے۔ کتب خانہ جہاں اب تک اس کی کتابیں الماریوں میں دھری ہیں، راہبوں کے حجرے کی طرح سادہ ہے۔ خوابگاہ مختصر اور تاریک سی ہے۔ قصر کے کونے کے بڑے گرجا میں اوپر ایسا دریچہ بنایا گیا ہے کہ اس کی روشنی قربان گاہ کو خوب نمایاں کر کے دکھاتی ہے۔ فلپ اپنی خوابگاہ کی کھڑکی سے بیمار پڑے پڑے بھی قربان گاہ کو دیکھ سکتا اور نماز باجماعت کی دعائیں سن سکتا تھا۔

فلپ کو اپنے باپ کے وسیع مقبوضات میراث میں ملے بجز اُن جرمن اضلاع کے جو شہنشاہی ملکیت ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ باپ کی طرح شہنشاہ منتخب نہیں ہوا تھا۔ مگر اپنے عہدِ حکومت میں اس نے لڑکر پرتگال کو شکست دی اور اسے سپین سے ملحق کر لیا۔ اس طرح وہ سارے ابیری جزیرہ نما کا فرماں روا بن گیا۔ پرتگال ساٹھ سال تک سپین کا جزو رہا لیکن فلپ چہارم کے

عہد میں پھر آزاد ہوگیا۔

چارلس نے بیٹے کو وسیع سلطنت کے ساتھ، یورپ کے دوسرے ملکوں سے جنگ و جدال اور دشمنی بھی ورثے میں دی تھی۔ یہ ملک سپین سے حسد کرتے تھے اور اس کی قوت اور حرصِ کشورستانی سے ڈرتے تھے۔ چارلس کی سی سپہ گری کا شوق فلپ کو نہ تھا اور وہ شاذونادر ہی فوجوں کو خود لڑانے کے لیے میدان میں نکلا ورنہ یہ زرد رُو دبلا پتلا آدمی میز کے سامنے بیٹھا گھنٹوں سرکاری کاغذات پر دستخط کرتا، اپنے قلم سے لمبے لمبے حکم لکھتا یا جنگی نقشے اور مراسلات کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ اس کے زمانے کی لڑائیوں کا شمار مشکل ہے۔ پرتگال سے جنگ ہوئی، ترکوں سے ہوئی جن کا دارالخلافہ قسطنطنیہ تھا اور یورپ میں بڑی سلطنت زیرنگیں تھی۔ فرانس سے کئی بار جنگ ٹھنی۔ فلینڈرس میں ہوئی اور خود غرناطہ میں موروں کے خلاف فوجی کارروائی کی گئی جبکہ ظالمانہ تعدی سے تنگ آکر یہ لوگ لڑنے پر تیار ہوئے۔ پاپائے رومہ کے خلاف بھی بڑی جنگ چھڑی رہی۔ ان سب محاربات کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ جو چیز سپینی یا سپین کے کیتھولک مذہب کے مطابق نہیں ہے، اسے فنا کردیا جائے۔

فلپ کی دو بحری جنگیں بھی تاریخ میں مشہور ہیں۔ ایک رسپانتو کا معرکہ اور ایک سپین کے بڑے بیڑے کی تباہی۔ ان میں سے پہلی ترکوں سے ہوئی۔ سپین، ریاست وینس اور پاپائے رومہ کا اتحادی بن کر یونان کے مغربی ساحل پر آبنائے سپانتو کے سامنے لڑا۔ اتحادی بیڑے کی قیادت فلپ کے من چلے سوتیلے بھائی آسٹریہ کے ڈون جوآن کے ہاتھ میں تھی جس نے بڑی دھوم دھام کی فتح حاصل کی۔ انگریز شاعر چیسٹرٹن کی نظم "سپانتو" یاد کیجیے جس کی یہ ٹیپ پوری نظم کے بین السطور گونجتی چلی جاتی ہے :۔

"چل پڑا ہے لڑنے کو، ڈون جونِ آسٹریہ"

فتحمند "ڈون جون" کی وہ تصویر کہ ہر طرف صفوں میں درّانہ گھس پڑتا ہے۔ تلوار چلا چلا کر خون کی ندیاں جہازوں اور سمندر میں بہا دیتا ہے، نظم پڑھنے والوں کے ذہن سے کبھی فراموش

نہیں ہوسکتی۔

لیکن انگلستان کے خلاف جنگی بیڑا (Armada) بھیجنا سپین کے حق میں سخت نقصان کا باعث ہوا۔ انگلستان کو ندرلینڈز کی باغی پروٹسٹنٹ رعایا کی مدد کرنے سے روکنے اور اس کی بحری طاقت توڑنے کی غرض سے فلپ نے اتنا بڑا جنگی بیڑا جمع کیا جو اُس زمانے میں کبھی جمع نہ ہوا تھا۔ اس میں ۱۳۲ جہاز اور تیس ہزار سپاہی تھے۔ بدقسمتی سے وہ امیرالبحر جس نے مہم کی تنظیم کی اور اسے خود لے کر جانے والا تھا، روانگی سے عین پہلے فوت ہوگیا اور فلپ نے اس کی جگہ اپنے ایک ایسے درباری کو مقرر کیا جو بحریات اور بحری جنگ سے بالکل ناواقف تھا۔ ہرچند اُس نے اپنی عدم اہلیت کا عذر کیا، فلپ نے ایک نہ سنی اور اُسی کو بیڑے کا سردار اعلیٰ بناکر رہا کیونکہ اُسے فتح کا پورا یقین تھا۔ اور کہتا تھا کہ ہمارے بیڑے کا اصلی امیرالبحر خدا ہوگا۔۔۔ مگر آئندہ واقعات سے ایسا معلوم ہوا کہ خدا سپین کے بیڑے کا نہیں، ان کے دشمن انگریزوں کے بیڑے کا امیرالبحر ہوگیا تھا۔ شروع ہی سے سپین والوں کے ساتھ تقدیر دشمنی کرتی رہی۔ سپین کے شمالی مغربی سرے سے چکر کھا کے جہاز آگے چلے تھے کہ طوفانی ہواؤں نے انھیں تتر بتر کردیا، کئی ڈوبے کئی ٹوٹ گئے۔ رودبار انگلستان میں پلائی متھ کے سامنے اور پھر کیلے کے قریب زیادہ تیز رو اور لمبی مار کی توپوں سے مسلح برطانی جہازوں نے سپین کے بھدّے بھاری بھرکم چند منزلہ جہازوں میں تباہی مچادی۔ سپین والے کسی تدبیر سے اتنے قریب جہاز نہ لاسکے کہ انگریزی جہازوں پر چڑھ کر دست بدست جنگ کرتے۔ جس پر اپنی کامیابی کا یقین رکھتے تھے۔ انگریزوں کے بل، بلیک ڈاگ، ٹیئر، ریوینج نام کے جہاز اِدھر سے حملے کرتے اور سپین کے بڑے بڑے نامی جہازوں کو جیسے سنتا ماریہ، سان مارکوس سان لوئی اور بے شمار دوسروں کو شمال کی طرف دھکیلتے یا ڈبوتے رہے۔ بحر شمالی میں برابر تلاطم اور خراب موسم کا دَور دورہ رہا جس پر انگریزوں نے خوب بغلیں بجائیں اور کتاب مقدس کی یہ آیت پڑھی "یہوداہ نے آندھی چلادی اور وہ منتشر ہوگئے"۔ بحر شمالی میں سپین

کے مزید ۱۹ جہاز غرقاب ہوئے۔ پھر کئی ہفتے فاقہ کشی، بحری خارش، بخار اور مزید طوفانوں اور مصیبتوں کو جھیل کر یہ بیڑا جو آدھا رہ گیا تھا گرتا پڑتا سپین کی بندرگاہوں میں واپس آیا۔ اس کے امرائے بحر میں سے ایک شخص کی نسبت لکھا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح چند جہاز سلامت لے کر سان سباستیان میں پہنچ گیا لیکن خشکی پر اُتر کر اس نے کسی شخص، حتّٰی کہ بیوی بچوں سے بھی کوئی بات نہیں کی بلکہ اپنے حجرے میں جا کر قفل لگایا اور دیوار کی طرف منہ کر کے پڑ گیا اور اسی حال میں جان سے گزر گیا۔

فلپ نے تسلیم و رضا کا زیادہ بہتر مظاہرہ کیا اور بیڑے کی تباہی کی خبریں سن کر صرف اتنا کہا کہ "مجھے یہ خیال نہ تھا کہ میرے بیڑے کو موسم سے جنگ کرنی پڑے گی"۔

بہرحال اس بڑے بیڑے کی ۱۵۸۸ء کے موسمِ گرما میں تباہی سے، یورپ میں سپین کی سیادت کا دعویٰ باطل ہو گیا اور فلپ کی وفات سے دس سال پہلے ہی اس کی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا اور یہ سلسلہ اس کے جانشینوں کے زمانے میں جاری رہا۔

صدی کے ختم ہوتے ہوتے ۱۵۹۸ء میں فلپ راہیِ عدم ہوا، اور آئندہ (سترھویں) صدی اس کے بیٹے فلپ سوم، پوتے فلپ چہارم اور پروتے چارلس دوم کے درمیان تقسیم ہو گئی۔ یہ تینوں اسی ہیپس برگ خاندان کے تھے۔ آخری بہت کمزور دل کا وہمی شخص تھا جسے باور ہو گیا تھا کہ شیاطین اس کے جسم و جان پر قابض ہیں۔

فلپ سوم نے "موریس کو" یعنی اُن موروں کے نکال دیے جانے یا جبراً عیسائی بنا لیے جانے کے حکم پر دستخط کیے جو سقوطِ غرناطہ کے بعد بھی سپین میں رہ گئے تھے۔ یہ لوگ بہترین کاشتکار بھی تھے اور ہر بستی میں راج، موچی، مستری، درزی، پارچہ باف کا کام کرتے تھے۔ جو اکثر اہلِ سپین کے نزدیک ادنیٰ اور حقیر پیشے تھے۔ یہ بچے کھچے مور صابر و متحمل لوگ تھے، مگر اپنی قدیم تہذیب کی تباہی اور جبراً عیسائی بنائے جانے نیز اپنی قیمتی کتابیں اور خوبصورت عمارتیں جلائے جانے پر بگڑ بیٹھے اور بار بار بغاوتیں کیں جو خاصی سنگین تھیں تا آنکہ ۱۶۰۹ء میں فلپ سوم نے حکم دیا کہ تین

دن کے اندر وہ سب ملک سے نکل جائیں، مرد عورت بچے جن کی تعداد ۵ء۹ لاکھ تک تھی شمالی افریقہ اور بحر متوسط کے دوسرے ساحلی مقامات کی طرف دھکیل دیے گئے۔ صرف ۶ فی صدی کے قریب رہنے دیے گئے تھے کہ اپنے مور طریقوں سے زراعت اور آب پاشی کرتے رہیں۔ کچھ مدت گزرنے پر بہت سے اور جلا وطن بھی سزا کا جوکھوں مول لے کر، چھپ چھپا کر، اپنے گھروں کو واپس آگئے تھے۔ اصل میں ان کے جانے سے خود سپین ہی نقصان میں رہا۔ وہاں کے (فرنگی) باشندے اُن دنوں سمندر پار قسمت آزمائی کرنے اور زر و جواہر سمیٹ لانے کے خواب دیکھتے تھے اور زیادہ باہمت اور لائق افراد فی الواقع ہزاروں کی تعداد میں نئی دنیا کو ہجرت کر رہے تھے۔ ادھر ہزاروں وہ تھے جو سپین کی فوجوں میں بھرتی ہو کر فلینڈرس، فرانس و اطالیہ میں لڑائیاں لڑ رہے تھے۔ انھیں روزمرہ ضرورت کی گھریلو صنعتیں جاری رکھنے کی فرصت نہ ملتی تھی۔ کاہل اور نکمے لوگ قصبات چھوڑ چھوڑ کر شہروں کی طرف بہے جا رہے تھے۔

سترھویں صدی میں سپین کی معاشی حالت بد سے بدتر ہی ہوتی چلی گئی۔ ہر طرف افلاس محتاجی نظر آتی تھی۔ متوسط طبقے کو ضروریات زندگی اور ادنیٰ طبقے والوں کو قوتِ لایموت تک میسر نہ آتی تھی۔ غریب لوگ اکثر فاقہ کشی سے مر جاتے تھے۔ بھوک، اس عہد کے ہسپانوی اہل قلم کا سب سے مقبول موضوع ہو گیا تھا۔ ایک مصنف اپنے زمانے کی حسب ذیل کیفیت تحریر کرتا ہے:-

"کھیتوں میں نکل کر دیکھو، جو کبھی ہرے بھرے لہراتے تھے، سوائے خار و خسک کچھ نظر نہ آئے گا۔ کیونکہ کوئی انھیں بونے جوتنے والا ہی اب نہیں رہا۔ اہل سپین کی اکثریت آجکل کوئی کام نہیں کرتی۔ کچھ لوگ تو امارتِ خاندانی کے جھوٹے دعوے کی بنا پر اور زیادہ تر اس لیے کہ انھیں بھیک مانگنے کا چسکا پڑ گیا ہے۔ میڈرڈ کے کوچہ و بازار عجیب مناظر دکھاتے ہیں۔ ہر جگہ آوارہ گرد و ناکارہ لوگوں کی کثرت ہے جو بیٹھے تاش کھیلتے رہتے ہیں اور یا خانقاہوں میں لنگر بانٹے جانے کا انتظار کرتے ہیں اور یا دیہات میں چوری چکاری

کرنے نکل جاتے ہیں۔ نکمے پن کی اس بیماری پھیلنے سے بھی بدتر یہ بات ہے کہ ان اُچکّے آوارہ گرد لوگوں کی کثرت اور بدچلنی سارے شہر کے اخلاق بگاڑتی اور بیمارستانوں کی آبادی بڑھاتی ہے۔"

نکما پن اقتصادی بدحالی کا نتیجہ بھی تھا اور سبب بھی ہوگیا تھا۔ ایک اور وجہ مالی مشکلات کی یہ ہوئی کہ تجارت اور صنعت پر وہاں نہایت مہمل پابندیاں لگائی گئی تھیں۔ یورپ بھر میں سپین کی جو مصنوعات مشہور تھیں، ان کی تیاری ایسے سرکاری ضابطوں میں جکڑی گئی کہ ان میں بہت کمی آگئی اور بیرونی تجارت جاتی رہی۔ مثال کے طور پر موچی مقررہ طرز اور نمونے کے جوتے نہ بنائے اور ٹھیک ٹھیک سرکاری احکام کی پابندی نہ کرے تو اسے سزا دی جاتی تھی۔ امریکہ کو عمدہ ریشمی اور اونی پارچہ بھیجنے کی ممانعت تھی۔ صرف "ادنیٰ" درجے کے تھان دساور جا سکتے تھے حالانکہ امریکی نوآبادیوں کو سوائے سپین کے دوسرے ملکوں سے تجارت کی اجازت نہ تھی۔ نتیجہ یہ کہ انگریز، ولندیز، فرانسیسی چوری چھپے ممنوعہ اشیاء لے جاتے اور آبادکاروں سے جنھیں ان کی ضرورت بھی تھی اور خرید بھی سکتے تھے، خوب نفع کماتے تھے۔ امریکی نوآبادیوں کی تجارت سے سپین کو حسب دل خواہ فائدہ نہ ہونے کی ایک وجہ یہ تھی کہ ساری تجارت چند افراد کے ہاتھ میں آگئی اور پہلے اشبیلیہ، پھر قادس کی واحد بندرگاہ کے راستے قطرہ قطرہ رِستی تھی۔ یورپ کی مذکورہ بالا تین قوموں کے مالا مال ہوجانے کا ایک اور سبب یہ ہوا کہ وہ سپین کے جہازوں کو جو امریکا سے سونا چاندی لاد لاد کر لاتے تھے سمندر میں پکڑ لیا کرتے تھے۔

محصولات کا بوجھ لوگوں پر بڑھتا گیا، پھر بھی چارلس اول (یا پنجم) ہی کے وقت سے بادشاہوں کی جنگی یا وسیع درباری ضرورتیں پوری نہ ہوتی تھیں۔ فلپ سوم تو بہت زمانے تک اپنے نوکروں کی تنخواہیں ادا کرنے ہی میں تغافل کرتا تھا۔ فلپ چہارم کی محتاجی کا یہ حال تھا کہ گرجوں میں صندوق رکھوا دیے گئے تھے اور اپنے ذاتی مصارف کے لیے رعایا سے

درخواست کرتا تھا کہ ان میں روپیہ ڈال کر اس کی مدد کریں۔ کمزور دل کے چارلس دوم نے شاہی اصطبل کے گھوڑوں کو بھوکا مرنے دیا اور یہ سمجھتا رہا کہ اس کے پاس انھیں کھلانے کے لیے روپیہ کہاں ہے؟ حالانکہ فلپ چہارم کی بیٹی، لوئی چہاردہم شاہ فرانس سے شادی کرنے روانہ ہوئی تو اسے اپنے چاندی کے ظروف اور عطریات لے جانے کے لیے ستر گھوڑے درکار ہوئے۔ ساٹھ منڈھے اور سیمیں پشتے کے بیس صندوقوں میں تو اس کے ملبوسات بھرے گئے اور دو صندوق جن کا پشتہ سونے کا تھا، وہ فقط اس کے دستانوں سے بھر گئے تھے۔

باب ہفتم

عہدِ زرّیں

سولھویں اور سترہویں صدی میں سپین کے عہدِ زرّیں کہنے سے ہماری مراد وہاں کی دولت و مال یا قوت و اقتدار نہیں ہے بلکہ ہسپانوی ذہانت کی شگفتگی اور علوم و فنون کا فروغ مقصود ہے کیونکہ یہی زمانہ تھا جس میں سپین کے مصنف اور مصوّر وہ شاہکار تخلیق کر رہے تھے جو آج تک دنیا کو لطف و سرور بخش رہے ہیں

ادبی خزینوں میں ایک قسم "پکارسک ناول (Picaresque) نکلی تھی جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میں کسی نہ کسی "پکارو" یعنی عیار یا چالاک ٹھگ کا قصہ ہوتا تھا۔ سپین کے اہل قلم اپنے گرد و پیش مفلسی اور رذالت پھیلی دیکھتے تھے۔ اسی میں وہ من چلے پن کے افسانے تصنیف کرتے تھے مگر یہ من چلا پن قدیم شجاعت کی داستانوں جیسا نہیں تھا۔ جن میں کوئی بانکا سپاہی اژدہوں سے لڑتا ہے کسی قصر یا جنگل میں مسحور ہو کر سو جاتا ہے، اور پھر بیدار ہو کر لڑتا اور کہیں کی مملکت یا خوبصورت شہزادی انعام میں جیت لیا کرتا ہے۔ عیاروں کے قصوں میں بدمعاش پکارو خونیوں، جوٹھوں کا یار ہے گندے نالوں اور کوٹھیوں میں چھپ کر سوتا ہے۔ بھوک میں بچی کھچی روٹی یا چند آنے چرالیتا ہے اور اس کی ملاقات بھی صرف ماما اصیلوں، بھٹیاریوں یا بڈھی مخمور ساقنوں ہی تک رہتی ہے۔ داستانوں کے سورما اپنی فوق العادۃ بہادری سے کامیاب ہوتے ہیں۔ پکارو فقط چالاکی سے زندگی بسر کرتا ہے۔ شجاعت کی داستانیں عشق اور جنگ کی خیالی دنیا میں چکر کھاتی ہیں۔ عیاروں کے قصے اصلی زندگی کے گلی کوچوں میں ٹنگ کرتے ہوئے چلتے ہیں۔ ان میں تنگ دست لیکن اکثر بے فکرے آوارہ اور

جرائم پیشہ موذی اشخاص کی سچی جھلک نظر آتی ہے۔ جو اُن دنوں شہر کے کوچہ و بازار میں ابھرے تھے اور ان کی وجہ سے مسافروں کو باہر سفر کرنا بھی مخدوش ہوگیا تھا۔ اُس زمانے کے وقائع میں جرائم اور افلاس و فلاکت کے یہی واقعات درج ہیں۔ عیاروں کے قصے فقط انھیں چٹ پٹا بنا کے پیش کرتے ہیں۔

پہلا اور مشہور پکارسک قصہ Lazarillo de Tormes ''لزارِلو دِتارمس'' ۱۵۵۴ء میں شائع ہوا۔ اسے صیغہ واحد متکلم میں قصے کا ہیرو خود سناتا ہے جس کا مفروضہ نام لزارِلو ہے اور یہ اس کی داستانِ حیات ہے۔ لزارِلو کا بدمعاش باپ شمالی افریقہ میں موروں سے لڑتا ہوا مارا جاتا ہے، ماں اس کی پرورش کا خرچ نہیں اُٹھا سکتی لہٰذا اجرت پر بچے کو ایک اندھے فقیر کے حوالے کردیتی ہے۔ یہ بڈھا فقیر صدہا دعائیں اور ان کا موقع محل خوب جانتا ہے۔ اسے کھانے کی چیزیں، روپیہ پیسہ افراط سے ملتا ہے مگر ایسا خسیس ہے کہ لزارِلو اگر اندھے کے تھیلے سے کھانا، صراحی سے شراب اور کبھی کبھی دو چار پیسے نہ چرائے تو فاقوں مرجائے۔ ایک دفعہ اندھا آقا اسے شراب پیتے پکڑ لیتا ہے اور غصے میں صراحی منہ پر مار کر توڑ ڈالتا ہے تو گر جانے والی شراب کو دھجیوں میں جذب کرتا اور اسی کپڑے سے لزارِلو کی خراشیں صاف کرتا ہے جو صراحی کے ٹوٹے ٹھیکروں سے اس کے منہ پر آگئی تھیں۔ اس بات سے اور اندھے کی دوسری ظالمانہ حرکتوں سے لزارِلو اس کا دشمن ہوجاتا ہے اور بدلہ لینے کے لیے اسے بُرے سے بُرے راستوں پر لیے پھرتا ہے ''ان میں جہاں پتھر ہوں اور کہیں کیچڑ ہو تو سب سے گہری کیچڑ میں سے''۔

فقیر کو چھوڑ کر اس نے ایک پادری کی نوکری کی لیکن یہ کھائی سے نکل کر کنویں میں گرنے کی بات تھی کیونکہ پادری بلا کا کنجوس تھا۔ لزارلو کو پیاز، پتلا شوربا، نچوڑی ہڈیاں کھانے کو دیتا کہ اس کا پیٹ کبھی نہ بھرتا تھا تاآں کہ اس نے پادری

کے صندوق کی کنجی چرالی جس میں پادری روٹیاں ذخیرہ کیا کرتا تھا۔ اس طرح فاقہ کشی سے نجات ملی اور کھانا غائب ہونے کا سبب اُس نے یہ گھڑا کہ چوہے اور سانپ صندوق میں جاکر کھا جاتے ہیں۔ مگر بالآخر چوری کرتے پکڑا گیا اور پادری نے اسے گھر سے نکال دیا۔ پھر وہ اوروں کے پاس رہا جن میں ایک راہب، ایک کوتوالی کا سپاہی اور ایک خاندانی صاحب ایسے تھے کہ جیب میں ٹکا نہ تھا مگر کپڑے اچھے پہنتے اور کوئی کام کرنا شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ لزارِ تو اپنی عیاریوں سے ان سب کے ساتھ نباہتا رہا لیکن گزر بسر مشکل ہی سے ہوتی تھی۔

سپین کے ان عیاروں کے قصوں نے یورپ میں ادب کی ایک نئی صنف کی طرح ڈالی اور ان کی انگلستان، فرانس، جرمانیہ وغیرہ میں تقلید کی گئی۔ خود ہمارے امریکی "ٹام سوئیر" اور "ہک فن" کے قصوں میں ان کا تھوڑا بہت رنگ جھلکتا ہے۔ مگر ان عیاروں اور ان کے عہد کے پاجی معاشرے کی سب سے اچھی تصویر مگوئل دسروِنتس (Miguel de Cervantes) نے اپنے مختصر افسانوں میں دکھائی ہے۔ "عہد زریں" کا یہ نامور اہل قلم زیادہ تر اپنے شاہکار "ڈون کوئکزٹ" (Don Quixote) کی وجہ سے مشہور و معروف ہوا، لیکن نقادوں کا قول ہے کہ وہ یہ قصہ نہ لکھتا تو بھی اس کے مختصر افسانے اسے شہرۂ آفاق بنانے کے لیے کافی تھے۔ ان میں ایک دِن کونیٹ اور کورتا دلّو، دو لڑکوں کا قصہ ہے، کہ ایک تو جیب کترا تھا اور دوسرا تاش میں ہاتھ کی صفائی دکھاتا تھا۔ یہ اشبیلیہ میں لُچّوں کی ایک ٹولی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ بہت سے اور بدمعاشوں سے بھی ملاقات رکھتے ہیں۔ کہانی میں مصنف نے حقیقت نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ پڑھنے والا آج بھی وادئ کبیر کی جہازی گودیوں کی گرمی اور گندگی محسوس کرتا، بو سونگھنے لگتا ہے۔ اُس کے کانوں میں وہاں کے قہقہے اور گالیاں گونجنے لگتے ہیں۔ وہ بلا فرش کے چھوٹے سے حجرے میں پہنچ جاتا ہے جہاں یہ بدمعاش جمع ہوا کرتے تھے ــــ حقیقت میں سروِنتس نے

اشبیلیہ کے کمینہ لوگوں کی نسبت جو کچھ لکھا وہ ذاتی تجربے پر مبنی تھا۔ وہ خود اشبیلیہ اور ولادولِد کے قید خانوں میں قید رہا۔ وہاں یقیناً اسی چال چلن کے اشخاص دیکھے ہوں گے جن کی وہ کہانیوں میں کیفیت دکھاتا ہے۔ اشبیلیہ میں اس کے قید کیے جانے کا سبب یہ تھا کہ سرکاری روپے کے حسابات ٹھیک نہیں رکھے۔ جن رقموں کا پتہ نہیں چلا، ان کے خیانت سے خود کام میں لانے کا الزام اس پر کسی نے نہیں لگایا لیکن اصل یہ ہے کہ حساب کتاب کے معاملے میں وہ بالکل کورا تھا۔ ولادولِد میں ایسے شخص کے قتل کرنے کے الزام میں محبوس ہوا جس کو جانتا بھی نہ تھا۔ مگر حملہ اور خون اس بڑے مکان کے سامنے ہوا تھا، جہاں سروینتس اور اُس کے اہل وعیال مصیبت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ غرض اس نے زمانے کے بہت گرم وسرد دیکھے اور اگر بے ایمانی پر کمر باندھتا تو پکّا پکارو بن سکتا تھا۔

جوانی میں طرح طرح کے نشیب وفراز اور خطرات پیش آئے۔ بیس برس کے سن سے آگے بڑھا تھا کہ نیپلز کے ایک نوجوان لاٹھ پادری (کاردنال) کے عملے میں نوکر ہوا۔ پھر ایک ہسپانوی لشکر میں بھرتی ہوگیا جو ترکوں سے بحری جنگ (سپانتو) لڑنے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ جس وقت عیسائی اور ترک بیڑوں کا سامنا ہوا تو وہ بخار میں مبتلا تھا مگر ضد کی کہ لڑائی میں شرکت کروں گا ورنہ لوگ الزام دیں گے کہ فرض ادا کرنے سے جان چراتا ہوں۔ عرشے کے نیچے پڑے رہنے سے کہیں بہتر ہے کہ اپنے خدا اور بادشاہ کے لیے جان جائے۔ لڑائی میں تین دفعہ زخمی ہوا تھا۔ ایک گولی نے اس کے ہاتھ کو بیکار کر دیا۔ زخموں کے اچھے ہونے کے بعد مزید فوجی خدمات انجام دیں اور جہاز میں سپین چلا کہ جانبازی کے صلے میں اسے کوئی عہدہ مل جائے گا لیکن راستے میں الجزائر کے بحری قزاق جہاز پر آچڑھے۔ کپتان اور بہت سے ملاحوں اور مسافروں کو قتل کیا اور جو بچے انھیں قید کرکے لے گئے اور غلاموں کے طور پر بیچ دیا۔ انھی میں سروینتس بھی تھا جسے ساڑھے پانچ برس قید غلامی بھگتنی پڑی اور بارہا بیڑیاں پہنائی گئیں کیونکہ چار دفعہ بھاگ نکلنے کی

کوشش کی تھی۔ آخر ایک راہب نے جو عیسائیوں کو چھڑانے کے لیے چندہ جمع کرتا تھا اور اپنی زندگی اسی کام کے لیے وقف کر دی تھی۔ اس کا فدیہ ادا کرکے اسے عین ایسے وقت چھڑایا جب کہ اس کا مالک قسطنطنیہ روانہ ہو رہا تھا۔ اور سروِنتس کو اس نے زنجیروں میں باندھ کر جہاز کے گودام میں ڈلوا دیا تھا۔

اس کے بعد سے اس کے باقی سوانح کا پتہ چلانا مشکل ہے کیونکہ عمر کے یہ آخری چالیس برس افلاس و گمنامی میں گزرے۔ اس نے ناٹک لکھے مگر وہ نہیں چلے۔ ایک ناول گوالوں اور گوالنوں پر اپنے زمانے کی انشا پردازی کی طرز میں تصنیف کیا، وہ بھی غیر شگفتہ ٹھس رہا۔ شاعری میں دو چار مرتبہ اُسے انعام ملے مگر شعر گوئی سے بھی بسر اوقات کے لائق آمدنی نہیں ہوتی تھی۔ اس نے شادی کی۔ ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ بہنیں بھی غریب تھیں اور اسی کے گھر میں رہتی تھیں۔ جس زمانے میں بڑے بیڑے کی تیاریاں ہو رہی تھیں سروَنتس نے فوجی ضروریات کی رسد رسانی میں سرکاری خدمات انجام دیں۔ سمندر پار چار مختلف نوکریوں کے لیے بھی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ کئی کئی سال وہ ہماری نظر سے اوجھل رہتا ہے، پھر کسی عدالتی یا دوسری دستاویز میں ہم اس کا نام سنتے ہیں۔ ۵۸ برس کی عمر میں اس نے "ڈون کوئگزٹ" کا پہلا حصہ شائع کیا تھا، دوسرا حصہ کہیں دس برس بعد مرنے سے ایک سال قبل مکمل کیا۔ یہ وہ ناول ہے جس کو بعض نقادوں نے دنیا کا بزرگ ترین ناول بتایا ہے۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ یہ صدیوں سے مقبول ترین کتاب چلی آتی ہے اور بائبل کے سوائے سب کتابوں سے بڑھ کر اس کے غیر زبانوں میں ترجمے اور طباعتیں ہوئی ہیں۔ ان کتابوں سے جن میں اس پر بحث کی گئی ہے، الماریاں بھری پڑی ہیں، ادبی نقاد، شاعر، فلسفی، سبھی اس کی ایک ایک سطر کو پڑھتے، اور صحیح معنی بتانے کی کوشش کرتے ہیں۔ قصے کا سورما ادھیڑ عمر میں لامانکہ (La Mancha) ضلعے کے ایک گاؤں سے مردانگی دکھانے چلا ہے، عجیب عجیب مہمات کا بیڑا اُٹھاتا ہے۔ مطالعہ کرنے والے غور کرتے ہیں کہ ان دیوانی حرکتوں میں

مصنف کیا سبق دینا چاہتا ہے۔

فرض کیجیے ہم اس قصے کو حقیقی دنیا کی داستانِ شجاعت سمجھ کر پڑھیں، کتاب کے پہلے ہی صفحے پر قصے کا سورما جس کے نام سے کتاب ڈون کِوِک زَٹ موسوم ہوئی، نمودار ہوتا ہے۔ آپ بلا تاخیر اس سے واقف ہو جاتے ہیں کہ وہ شرفا کے طبقے کا آدمی ہے۔ ایک دبلا گھوڑا اور شکاری کتّا رکھتا ہے، اپنے آبائی مکان میں ایک بھتیجی اور خانگی ملازم کے ساتھ رہتا ہے۔ آمدنی اتنی کم ہے کہ تین چوتھائی تو کھانے ہی کے خرچ میں نکل جاتا ہے اور باقی ماندہ کپڑے بنانے میں۔ البتہ فرصت کا وقت کافی ملتا ہے، جسے ڈون بہادری کی داستانیں پڑھنے میں صرف کرتا اور ایسا کتاب کا کیڑا بن جاتا ہے کہ پھر کسی سیر و شکار یا اپنی چھوٹی سی زمین داری کی دیکھ بھال کرنے کا بھی اسے ہوش نہیں رہتا۔ اتنا زیادہ پڑھنے اور کم سونے کی وجہ سے اس کے دماغ میں خشکی آگئی۔ وہ سوچتا ہے کہ داستانوں کے مردانِ غازی کی طرح خود دنیا میں نکلے اور چونکہ عقل بالکل جاتی رہی ہے۔ اُسے یقین ہو جاتا ہے کہ وہ بزورِ شمشیر دنیا کی خرابیاں دور کر دے گا — اب وہ اپنے دادا کا زرہ بکتر نکالتا ہے جو کوٹھری میں پڑے پڑے زنگ خوردہ ہوگیا تھا۔ مگر اُسے بڑا خود نہیں ملتا، صرف چھوٹے چھجّے کی زنانہ طرز کی ایک فوجی ٹوپی ملتی ہے لہذا گلٹ کا ایک مغفر یا بڑا چھجّہ بنا کر اسے وہ لیئی سے چپکا لیتا ہے لیکن آزمائشی وار میں گلٹ کا چھجّہ پھٹ جاتا ہے اور اُسے دوسرا مغفر تیار کرنا پڑتا ہے۔ ازراہِ احتیاط دوسرے چھجّے کی وہ آزمائش نہیں کرتا کہ مہم پر چڑھنے سے پہلے کہیں یہ خود بھی خراب نہ ہو جائے۔ اپنے بڈھے گھوڑے کو اس نے "روزی نَنٹ" کا شاعرانہ نام دیا مگر بلند بانگ لفاظی کے باوجود وہ ایک مریل لدّو ٹٹو ہی رہا۔

داستانوں میں ہر بانکا کسی دوشیزہ پر فریفتہ ہوتا ہے لہذا ڈون کی بھی کوئی محبوبہ ہونی ضروری تھی۔ اس کے نزدیک جو مردِ بہادر عشق سے خالی ہے وہ ایک جسم

ہے، بے روح۔ یا درخت ہے جس میں نہ پھل ہیں نہ پتے۔ مدّت سے وہ اپنے قریبی گاؤں کی ایک لمبی تڑنگی خوبصورت لڑکی کو دل ہی میں چاہتا تھا اگرچہ وہ لڑکی اُس کے نام و نشان سے بھی بے خبر تھی۔ ڈون نے اسے اپنی مطلوبہ محبوبہ قرار دیا۔ چونکہ اس کا دہقانی نام الدونزا، کچھ رنگین داستانی قسم کا نہ تھا لہٰذا اسے "دُل کینیہ دل تبوسو" موسوم کیا اور دل و جان سے اس پر نثار ہونے کی قسم کھالی۔

اس کے عجیب و غریب کارناموں کا ایک نمونہ سنیے۔ مگر اس سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اول تو اُس نے ایک سرائے والے سے (اسے مالکِ حصار تصوّر کرکے) اپنے آپ کو نائٹ (بہادر، بانکا یا سردار) بنوایا پھر یہ سوچ کر کہ ہر بہادر سردار کا کوئی خادم رفیق ضرور ہوتا تھا، اپنے گاؤں میں واپس آیا اور ایک فربہ اندام ہمسایہ زمین دار کو ترغیب دی کہ اپنے بیوی بچے چھوڑ کر اُس کے ہم رکاب مہمات میں شریک رہے۔ یہ شخص سانکو پانزا اُس کی طرح پاگل نہیں بلکہ خاصا سیانا آدمی ہے لیکن جنگل پہاڑ میں گشت لگانے اور دھاوے مار کر بے حساب مال و دولت میں اپنے فاتح آقا کا حصّہ دار بن جانے کے خواب دیکھتا ہے اور خوشی خوشی اپنے گدھے پر چڑھ کر اس کے ساتھ چل پڑتا ہے۔ ہر چند اس کا آقا پَون چکّیوں کو دیو کہہ کر ان پر حملہ کرتا ہے اور ایک بڑے پنکھ کی لپیٹ میں آکر گھوڑے سے گرتا اور سخت چوٹ کھاتا ہے لیکن سانکو چکیاں دیکھنے کے باوجود اپنے آقا کی بات کو زیادہ دیر تک نہیں جھٹلاتا بلکہ اس کا یقین لے آتا ہے۔

سانکو بھیڑ بکریوں کے ایک ریوڑ بھی بخوبی دیکھ لیتا ہے مگر اس کا آقا مصر ہے کہ یہ ایک لشکر چلا آرہا ہے۔ سانکو کہتا ہے، صاحب یہ دو ریوڑ دو طرف سے اسی مقام پر آرہے ہیں جہاں ہم ابھی ٹھہرے تھے، پھر بھی مسکینی سے پوچھتا ہے" مالک، اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟ ارے ہمارا فرض کمزور، ضرورت مند کی مدد کرنا ہے۔ او سانکو، جان لے کہ وہ سپاہ جو ہمارے سامنے سے بڑھی آرہی ہے جزیرۂ بزرگ ترا پوبانا کے شہنشاہ الی فن فاروں کی سپہ سالاری میں ہے اور ہماری پشت کی طرف اس کے دشمن شاہِ گرامتاس کی فوج ہے جس کا نام پنتاپولن اور

لقب" بلند بازو" ہے کیونکہ میدانِ جنگ میں وہ ہمیشہ سیدھے ہاتھ کی آستین چڑھا کے ننگا ہاتھ لیے لڑنے نکلتا ہے"۔ سانکو سوال کرتا ہے کہ "یہ ایک دوسرے کے دوست کیوں نہیں ہو جاتے؟" ڈون کوِک زٹ جواب دیتا ہے کہ ان میں عداوت کا سبب یہ ہے کہ اَلی فن فارون" بکواسی کافر ہے اور پنتاپولن کی حسین و دلربا لڑکی کی محبت میں دیوانہ ہو رہا ہے مگر وہ مسیحیہ ہے اور اس کا باپ جب تک اَلی فن اپنا دینِ اسلام نہ چھوڑے اور ہمارے مذہب میں نہ پلٹ آئے اسے کافر بادشاہ سے بیاہنا نہیں چاہتا۔

یہ سن کر سانکو جوش میں آتا اور جو کچھ دیکھ رہا ہے اسے غلط سمجھ کر پکار اُٹھتا ہے کہ "مجھے اپنی ڈاڑھی کی قسم، پنتاپولن بہت اچھا کر رہا ہے، جہاں تک ممکن ہے بندہ اس کی مدد کرے گا"۔

پھر بانکا سردار اور اس کا رفیق ایک پہاڑی ڈھلان سے اُترتے اور نیچے گرد کے دَل بادل اُٹھتے دیکھتے ہیں تو ڈون برابر نامی سرداروں اور امیروں کے نام گنواتا رہتا ہے جو اس دھندلکے میں گھوڑوں پر سوار چلے آرہے ہیں۔ ان کے مختلف ہتھیار، ڈھالیں، جھنڈے تک بتاتا ہے۔ بچارا سانکو آنکھیں مل مل کر دیکھتا اور اقرار کرتا ہے کہ اسے کوئی بھی نظر نہیں آتا۔ پھر یہ کہہ کر صبر کرلیتا ہے کہ "یہ ضرور جادو کا اثر ہوگا"۔ تاہم جب ڈون گھوڑا اُڑا کر ریوڑ پر جا پڑتا ہے تو سانکو ڈھلان پر ہی رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کا آقا کئی بھیڑیں ہلاک کرتا اور خود گلہ بانوں کی سنگ باری سے سخت زخمی ہو کر مرنے کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ تب سانکو جلدی جلدی جا کر اسے سنبھالتا اور یہ طعنہ ضرور دیتا ہے کہ کیوں میں نہیں کہتا تھا کہ آپ بھیڑوں کے ریوڑ پر حملہ کر رہے ہیں۔

افسوس ہے ہم اس جوڑے کے ساتھ دور تک نہیں جا سکتے کہ غبار آلود راستوں، پہاڑی جنگلوں اور اس زمانے کی گندی سراؤں کے اصلی مناظر بھی دیکھیں اور پھر سانکو کی طرح اس بات کا بھی تھوڑا بہت یقین کرنے لگیں کہ شاید حقیقت اتنی سچی نہیں جتنے

سر پھرے ڈون کے خیالی گدّے اصلی ہیں ــــ سروینٹس کی شہرت بین الاقوامی ہے کیونکہ ڈون کوک زٹ ہم سب کا سورما معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں لوپ دِوِگا اگرچہ غیر معمولی ذہانت میں سروِنٹس ہی کی مثل ہے لیکن سپین سے اتنی خصوصیت رکھتا ہے کہ ہم اس کا نام زیادہ سنتے ہیں، کتابوں سے واقف نہیں۔ یہ بھی کسی نے کہا ہے کہ اس نے جتنی کتابیں لکھیں اگر ان سے آدھی لکھتا تو جتنا اب مشہور ہے اس سے دگنی شہرت کا مالک ہوتا حقیقت میں نقادوں کو ایسے مصنف کی نسبت رائے لگانے میں تامل ہوتا ہے جس کی معلوم تصانیف میں ۴۷۵ ضخیم ناٹک یقینی اس کے ہیں اور مزید ۵۳ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ اسی نے لکھے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک باب کی ۵۰ مذہبی تمثیلات، جو "اَو تو" (Auto) یعنی "یک بابہ" کہلاتی ہیں، ہزاروں صفحات نثری افسانوں اور تاریخ پر اور طول طویل بیانیہ نظمیں اس کی یادگار ہیں۔ کوئی شبہ نہیں کہ وہ دنیا کا سب سے کثیر التصانیف صاحبِ قلم گزرا ہے۔ اٹھارہ سو طولانی ناٹکوں میں المیہ، طربیہ سبھی نمونے کے ناٹک اس نے لکھے۔ ایک قسم "کپا یے اِسپارا ا Capa Yespada = چغہ اور تلوار کے کھیل، تھی جس میں طرح طرح کے بہروپ، چھل بٹے، دھوکے فریب دکھائے جاتے ہیں۔ لوپ اکثر دو دن میں ایک بڑا ناٹک لکھ ڈالتا تھا۔ لمبے لمبے حرفوں میں خود لکھتا اور کسی کاتب یا مددگار سے کام نہ لیتا تھا۔ سپین کے بڑے بیڑے (Armada) کے ساتھ روانہ ہوا تو خالی وقت میں جہاز پر ہی ایک لمبی بیانیہ نظم گیارہ بند کی لکھ ڈالی۔ اپنے افسانوں کے موضوعات کے لیے بہت سے ماخذوں کو اس نے کھنگالا ہے: بائبل کے قصے، اولیا کے تذکرے، سپینی کہانیاں، بہادری کی داستانیں، اطالیہ، نِدرلینڈز، الجزائر اور غرناطہ کے موروں سے جنگ و جدال سبھی سے کام لیا ہے۔ روز مرہ زندگی کی ایسی صاف اور سچی تصویریں کھینچی ہیں کہ پڑھنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سہ رنگی سینما دیکھ رہا ہے۔ اس کے اشعار میں بڑی روانی، دل کشی، گداختگی ہے جو ترجمے میں نہیں آسکتی۔ پھر خیالات ہیں کہ چھلک چھلک کر اُمنڈتے چلے آتے ہیں۔ ان میں

عشق و مردانگی، حبِ وطن کے جذبات، طنز و مزاح اور کبھی کبھی بڑے پتے کی باتیں آجاتی ہیں۔ مثلاً چیخنے اور تلوار کے ایک طربیہ A certainty for a Doubt میں یہ شعر آتے ہیں :۔

"زبان سے ہم بولنا سکھاتے ہیں، آدمی کیا پرندکو بھی
مگر ابھی تک نہیں سکھایا خموش رہنا، سکوت کرنا۔
غضب ہے ہم مدرسے بنائیں، زباں چلانا وہاں سکھائیں
مگر نہ ہو ایک مدرسہ بھی زبان کو جو روکنا سکھائے"

لوپ کا کوئی ناٹک انگریزی میں نہیں دکھایا گیا مگر چند ناٹکوں کے انگریزی، فرانسیسی، جرمن روسی، پولش، یدّش زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں اور ممالک یورپ میں اکثر ان کے کھیل بھی دکھائے گئے ہیں خود سپین میں ۱۹۳۹ء سے لوپ اور اس کے معاصرین کے ناٹک بار بار دکھائے جارہے ہیں۔

عہد زرّیں میں اور بھی کئی بڑے ہسپانوی تمثیل نگار ہوئے ہیں۔ ان میں پیڈرو کال ڈرون Pedro Calderon) بیرونی ملکوں میں لوپ سے بھی زیادہ معروف ہوا۔ چند انگریز شاعروں نے اس کی تابناک نظموں کو انگریزی میں منتقل کیا ہے۔ اس کے ناٹک Magico prodigisso (عجیب جادوگر) اور La Vida es sueno (زندگی ایک خواب ہے) کے نام آپ نے سُنے ہوں گے۔ ان میں سے پہلا ایک کافر عالم کا قِصّہ ہے جس نے اپنی رُوح شیطان کے ہاتھ بیچ دی تھی۔ اس کی محبوبہ مسیحی لڑکی نے اسے بچایا، اور پھر وہ مسیحی ہوکر اسی کے ساتھ شہادت کے درجے کو پہنچا۔ دوسرا ناٹک ایک شہزادے کی کہانی ہے کہ نجومیوں نے اس کے ظالم اور موذی ہونے کی پیش گوئی کی تو اس کے باپ (بادشاہ) نے بچپن سے ایک تنہا گنبد میں نظر بند کردیا تھا۔ آزمائش کے لیے ایک مرتبہ نشہ پلا کے اسے بیہوش کیا اور دربار میں لائے، یہ بھی باور کرایا کہ

اب تک جو کچھ گزری وہ اس کا بُرا خواب تھا لیکن باہر رہ کر اس نے وحشیانہ حرکتیں کیں تو پھر اسے نشہ پلا کے اسی گنبد کے بندی خانے میں بھیج دیا گیا اور اب وہاں کے محافظ نے اسے یقین دلانا شروع کیا کہ دربار میں جو کچھ اس نے دیکھا وہ محض خواب تھا— بالآخر شہزادہ پھر باپ کے پاس لایا جاتا ہے اور اسے عقل و شرافت سے رہنا آجاتا ہے۔

لُوپ کے مقابلے میں کال ڈِرون کی تصانیف کم ہیں۔ پھر بھی ۱۲۰ ناٹک، بہت سے "اَوٗتو" اور سپین کے اولین "زر روے لا" یعنی ناچ گانے کے چھوٹے چھوٹے سانگ جو عموماً پرانے عوامی گیتوں پر مبنی ہوتے ہیں، اس نے لکھے۔ یہ سانگ اسی کے زمانے سے مقبول ہوئے البتہ اب ان میں تبدیلی آرہی ہے اور عوامی گیتوں کی بجائے ان میں جدید راگ راگنیاں زیادہ چل پڑی ہیں۔

تیسرا مشہور تمثیل نگار ترسودِ مولینو، ۳، ۴ سو ناٹکوں کا مصنف تھا۔ اُس کا (El Burlador de Sevilla = اشبیلیہ کا شوخ فریبی)، خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے جس نے ہم کو عاشق مزاج، بہادر، بے اصول، بے رحم ڈوان جوآن سے معارف کرایا۔ فرانس، برطانیہ، اطالیہ، آسٹریہ کے شاعروں اور مصنفوں نے بھی اسے مستعار لیا اور سپین میں تو ترسو کے وقت سے اب تک نہایت مقبول رہا۔ سو سال سے زیادہ ہوئے ہیں، ایک ہسپانوی اہل قلم جوسا زوالانے اسے اپنے ناٹک (Doṇ Juan Tenorio) کا مرکزی کردار بنایا۔ اس میں وہ اپنے جرائم کی پاداش میں دوزخ میں بھیجے جانے کے لائق قرار پاتا ہے لیکن ایک پاکباز دوشیزہ دونا اِناس اپنی محبت سے اسے نجات دلا دیتی ہے۔ یہ کھیل سپینی بولنے والوں میں اس قدر دل پسند ہوا کہ ایک صدی سے بھی زیادہ مدت سے ہر سال سپین اور لاطینی امریکہ کی تماشا گاہوں میں ماہ نومبر کے ابتدائی دنوں میں دکھایا جاتا ہے یعنی کیتھولک تہوار "آل سولز ڈے" کے قریب جس میں اس فرقے کے لوگ مرنے والوں

کے حق میں دعائے مغفرت مانگا کرتے ہیں۔

عہدِ زریں میں اعلیٰ درجے کے اہل قلم کے سوا سپین میں بہت سے شہرۂ آفاق مصوّر بھی گزرے ہیں جن میں بزرگ ترین El Greco, Velasquez, اور Murillo تھے۔ ہم میں سے بہت سے لوگوں نے ان کی پردوں پر بنائی ہوئی قلمی تصاویر دیکھی ہوں گی۔ ان میں سے پہلے کا اصلی نام بہت لمبا چوڑا تھا مگر اسے مختصر کرکے "اِل گریکو (یعنی یونانی)" کہنے لگے۔ کیونکہ وہ یونان کے جزیرے کریٹ میں پیدا ہوا تھا۔ اطالیہ کے اساتذۂ فن کے پاس کام کرنے کے بعد ۱۵۷۵ء میں سپین آیا اور طلیطلہ میں بس گیا۔ زندگی کے باقی چالیس سال وہیں گزارے۔ آپ اس کی صرف ایک تصویر دیکھ لیں تو پھر باقی سب کو پہچان سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کی غیر معمولی ذہانت کا اسلوب سب سے الگ ہے اور چھپائے نہیں چھپ سکتا۔ لمبی لمبی بل کھاتی ہوئی شکلیں اور ان کے پتلے پتلے لمبوترے چہرے۔ علیٰ ہذا بھیانک رنگ اور خوف انگیز قسم کی فضا گویا برق و باراں کا طوفان آنے کو تلا کھڑا ہے۔ ولایات متحدہ میں اس کی بہت سی تماشی تصاویر موجود ہیں جن میں سب سے مشہور ال گریکو کا "طلیطلہ کا نقش" نیویارک کے میٹروپالیٹن میوزیم کی زینت ہے۔ نقاش کے تصور میں طلیطلہ، پکائی ہوئی مٹی اور گہرے بادامی رنگ کی عمارتوں کا شہر نہیں ہے بلکہ عجیب طرح کے نامانوس ہرے، اور بھورے بھورے سفیدی مائل برج و بارہ کا مجموعہ ہے جو افسردہ سبزہ زاروں میں ڈھلتا چلا آتا ہے۔ اوپر نیلگوں چتیاں پڑا آسمان اور نیچے ندی کی زیرِ آب کاہی رنگ کی کیچڑ پھیلی ہوئی ہے۔ ال گریکو کی یہ تصویر دیکھنے کے بعد آپ طلیطلہ کا وہ تصوّر جو نقاش کے ذہن میں آیا، کبھی نہیں بھول سکتے۔

پراڈو (میڈرڈ) کے نگار خانے میں بہت سے ملکوں اور زمانوں کی تصاویر کا قیمتی سرمایہ ہے لیکن یقین ہے کہ پہلی ہی دفعہ کی سیر میں آپ کی نظر صرف ایک نقاش کے شہکار دیکھ کر خیرہ ہو جائے گی۔ یہ ولاس کوئز (Velasquez) جس کی تصاویر کا بڑا حصہ

(کوئی پچاس تصویریں) یہاں محفوظ ہیں۔ اس مصوّر نے شاہ فلپ چہارم کے دربار کو نقشِ جاودانی بنا دیا ہے کہ اور کسی نقاش نے کسی بادشاہ کی ایسی پرشکوہ خدمت انجام نہیں دی۔ خود فلپ کی سات شبیہیں اور اس کے خوبرو فرزند کارلوس کی (جو ۱۶ سال کی عمر میں مرگیا) چند دل کش تصویریں، اسی طرح اس کی بیٹی مارگریٹا ٹریا اور شاہی خاندان کے دوسرے افراد نیز درباریوں کی تصاویر بنائی ہیں بلکہ دربار کے بونوں کی بھی بڑی توجہ کے ساتھ صورت کشی کی ہے۔ قلم کی کشش اور سحر آمیز دھوپ چھاؤں کے رنگ بنانے میں کوئی نقاش ولاس کوئز سے بازی نہیں لے جا سکا۔ اپنے گردوپیش کو جیسی صحت سے اس کی آنکھوں نے دیکھا اور اس کے پختہ کار ہاتھوں نے انھیں قماش پر منتقل کیا، اس میں کوئی اس سے فائق نہیں ہوا۔

اس کا عظیم شاہ کار Las Meninas (= سہیلیاں) اپنے خاص کمرے میں سب سے الگ آویزاں ہے۔ مقابل کی دیوار پر بڑا آئینہ لگا دیا ہے جس میں تصویر کا عکس نظر آتا ہے جس طرح کہ خود مصوّر نے وہ منظر تصویر بناتے وقت آئینے میں یقیناً دیکھا ہوگا۔ خود اس کی صورت بھی بائیں طرف آپ کے سامنے دکھائی دیتی ہے۔ اصلی اور تصویری آئینے دیکھ کر آپ محوِ حیرت ہو جاتے اور محسوس کرتے ہیں کہ افسانے کی الامیس کی طرح گویا آئینے کے راستے پھسل کر دوسری دنیا یعنی فلپ کے دربار میں پہنچ گئے۔ آپ کے بالکل بالمقابل بھورے بالوں کی چھوٹی شہزادی ٹریا ایسی جیتی جاگتی کھڑی ہے جیسے ابھی اپنے سفید ساٹن کے کپڑوں میں آپ کو چھوتی ہوئی گزری ہے۔ پھر آپ اس کی خوبصورت سہیلیوں کو دیکھتے ہیں۔ اس کا بڑا سا کتا نیم خوابیدہ آپ کو دو بدصورت بونوں میں اچھا معلوم ہوتا ہے۔ دائیں طرف کے دریچے کی روشنی شہزادی اور سہیلیوں کے چہروں پر پھیلتی ہوئی اور وسیع نگار خانے کے سرے کے دروازے سے پوری کھل کر پڑ رہی ہے۔ دوسری جگھوں دھوپ چھاؤں سے چاندی کا غبار سا اڑتا نظر آتا ہے۔ تصویر میں نگار خانے کی عقبی دیوار پر جو آئینہ دکھایا ہے اس میں شاہ فلپ اور اس کی بیوی کا دھندلا عکس بھی بنایا ہے اور وہ ہمیں بالکل

اپنے قریب کھڑے معلوم ہوتے ہیں۔ دھوکا ہونے لگتا ہے کہ کہیں ہمارا عکس بھی ان کے ساتھ تصویر میں نہ اتر آئے

ولاس کوئز اور مریلو (Murillo) دونوں اشبیلیہ میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے لیکن پہلا اٹھارہ سال بڑا تھا اور ترقی کرکے بادشاہی مصور ہوگیا تھا۔ جب اس کا ہم وطن مریلو غربت وگمنامی کی حالت میں میڈرڈ آیا۔ ولاس کوئز نے کئی اعتبار سے اس کی پشت پناہی کی لیکن اس کی طرز نقاشی پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔

ولاس کوئز دنیا والوں کی صورت گری کرتا ہے جو اسی دنیا میں رہتے ہیں۔ مریلو بی بی مریمؑ اولیاء اللہ اور فرشتوں کا نقاش ہے۔ ان کی صورتیں انسانی ہیں مگر ان میں ایسی شیرینی اور شگفتگی ہے کہ مافوق الانسان معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تصویر میں مقدس دوشیزگان کو ننھے فرشتوں کے آسمان کی طرف پرواز کرتے دکھایا ہے۔ یہ دیکھنے کے قابل ہے۔ میڈرڈ کے پراڈو میں اس کی بنائی ہوئی چالیس تصاویر ہیں لیکن اشبیلیہ اس کا گھر ہے اور وہاں کا پسندیدہ مصور وہی ہے۔ وہاں کے گرجوں، خانقاہوں اور دوسری عمارات میں اس کی بہت سی تماشی تصویریں ملیں گی اور وہیں پرانے محلے کے ایک احاطے میں آپ کو اس کا مکان لوگ دکھائیں گے۔ مذہبی موضوعات کے علاوہ مریلو کی کوئی تصویر ملے تو وہ بھی اشبیلیہ کی یاد دلائے گی۔ بدقماش لڑکے، خربوزے، انگور یا روٹی کھاتے ہوئے، عجب نہیں یہاں کے وہی چھوکرے ہوں جنھیں وہ دریا کے قریب اُچکوں کی بستیوں کے آس پاس دیکھا کرتا تھا۔ آج بھی آپ شام ہوتے اشبیلیہ کی کسی تنگ گلی سے گزریں اور ڈھلتی دھوپ کو بھورے سنہری رنگ بدلتے دیکھیں جنھیں مریلو اپنی تصویروں میں بھرنے کا شوقین تھا تو کسی دریچے پر نظر جاتے ہی آپ کو خیال آئے گا کہ شاید وہاں سے کوئی سیاہ چشم حسینہ آپ کو جھانک کر نہ دیکھنے لگے جن کی مریلو نے کمال تازگی اور نفاست سے صورتیں بنائی ہیں۔

باب ہشتم

کلنگ کا ٹیکہ: احتساب

سپین کے مذہبی احتساب کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ کیتھولک فرقہ کی یہ عدالت فردیناند اور ازابلا نے قائم کی تھی (پاپائے روم نے بادلِ ناخواستہ اس کی اجازت دی تھی) تاکہ لوگوں کے عقائد اور اعمال کی باز پرس کرے اور سرکاری مذہب سے جو لوگ ذرا سے بھی ہٹے ہوئے ہوں اُن کو سزا دے۔ یوں مسیحی یورپ میں احتساب کا محکمہ تیرھویں صدی سے قائم تھا لیکن سپین کی اس عدالت نے جیسی سرگرمی اور سختی دکھائی وہ پہلے نہیں دیکھی گئی تھی۔ ازابلا تو چاہتی تھی کہ اس کے ذریعے کیتھولک لوگوں کو مذہب کا پابند رکھا جائے اور فردیناند اسے کارگر سیاسی ہتھیار سمجھتا تھا۔ سپین میں کلیسا کی نگرانی بھی ان دنوں بادشاہ کے ہاتھ میں تھی لہذا اس کی حکومت کا مخالف کلیسا یا مذہب کا مخالف قرار دے کر عدالت احتساب کے سامنے سزا کے لئے پیش کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح ازابلا اور فردیناند، اور یا ان کے پادری صاحب تو احتساب کو اہل سپین کے دین ایمان کی سلامتی اور قوم کے اتحاد اور مضبوطی کے لیے بہت اچھی تدبیر جانتے ہوں گے لیکن مجموعی طور پر ملک والے اس خیال میں اُن کے شریک نہ تھے۔ ارغونہ، بلنشیہ اور قیطلونیہ کے صوبوں میں تو عوام اور پادری سب نے احتساب کے عمال کی پذیرائی کرنے اور وہاں مقامی عدالتیں قائم کرنے میں مدد دینے سے انکار ہی کر دیا تھا۔ خصوصاً قیطلونیہ نے تین سال بادشاہ سے حجتیں اور تکرار کرتے رہے۔ پھر نہیں جا کر فردیناند کو موقع ملا کہ وہاں کے صدر مقام برشلونہ میں عدالتِ احتساب قائم کرے۔

بہر حال احتساب کا یہ نظام قائم ہوا اور سپین کی تاریخ کا سب سے شرمناک باب اس نے شروع کیا۔ ہم اس کو کسی طرح جائز نہیں کہہ سکتے البتہ اس کی ایک حد تک یہ وجہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس زمانے میں سارا مسیحی یورپ جس وبا میں گرفتار تھا اس کی سب سے بڑی اور دیر تک چلنے والی مثال سپین کا یہ احتساب تھا۔ پھر یہ ملک اور کیتھولک مذہب ہی ظلم اور تعدّی کے اکیلے مجرم نہ تھے بلکہ اسی طرح کے ظالمانہ جذبات یورپ کے دوسرے ملکوں اور فرقوں میں بھی متعدی ہو رہے تھے۔ کیتھولک فرقے کی طرح لوتھری گروہ نے بھی اختلاف کرنے والے مُراوی (Morovian) اور ڈنکرد (Dunkard) فرقوں پر وہ ظلم توڑے کہ ان کے بہت سے پیرو گرفتاری سے بچ کر ولایات متحدہ کو بھاگ آئے۔ سوئٹستان میں تو پروٹسٹنٹ مذہب کے مشہور پیشوا جون کالون (John Colvin) ہی نے سپین کے نامی طبیب مگوبل سروتو کو ملحِد قرار دے کر آگ میں جلا دیا جس سے دورانِ خون کی دریافت کا کارنامہ منسوب کیا جاتا ہے۔ غرض، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں ہی اپنے مذہب کی وجہ سے فرانس اور انگلستان میں ہلاک ہوئے۔

عدالتِ احتساب نے اپنا نشان ایک سبز صلیب کو بنایا تھا اور سارا سپین اسے دیکھتے ہی ناک رگڑنے لگتا تھا۔ ہر طبقے کے لوگ اس خوفناک عدالت کے سامنے جواب دہ ہوتے تھے۔ ان میں پادری بھی تھے جنھیں مذہبی عقائد کی کسی جزی بات میں اختلاف ہو۔ وہ یہودی بھی جو عیسائی ہو گئے تھے، مگر ان کی صداقت میں شبہ کیا جاتا تھا۔ وہ خبطی مرد عورتیں بھی جنھیں خواب وغیرہ میں کشف یا الہام کا دعویٰ ہوتا تھا اور وہ انگریز اور ولندیز ملاح بھی جن کے جہاز کھلے سمندر میں یا سواحل امریکا پر چھاپے مارنے کی بنا پر پکڑ لائے جاتے تھے۔ کبھی کبھی عدالت اہل قلم اور مصوّروں سے بھی مواخذہ کرتی تھی لیکن جہاں تک ہمیں علم ہے ایسے کسی صاحبِ فن کو اس نے موت کی سزا نہیں دی۔ ممالک امریکا کے دیسی لوگ عدالت کی حدود اختیار سے خارج تھے۔ اور خانہ بدوش جپسیوں پر بھی وہ اعتنا نہ کرتی تھی حالانکہ یہ آوارہ گرد سارے سپین میں

گھومتے پھرتے تھے، مذہب کا مذاق اُڑاتے اور علانیہ بدچلنی کی زندگی بسر کرتے تھے۔

یورپ کی تمام قانونی عدالتوں کا ۱۵، ۱۶، اور ۱۷ ویں صدی میں عام دستور تھا کہ اقبالِ جرم کرانے کے لیے ملزموں کو سخت تکلیفیں دلواتی تھیں، عدالتِ احتساب نے بھی اسی دستور کی پیروی کی۔ ایسا وحشیانہ برتاؤ سبھی عدالتیں کرتی تھیں۔ تاہم یہ عمل بہت "غیر مسیحی" اور ایک مذہبی عدالت کے لیے سراسر شرمناک معلوم ہوتا ہے۔ عدالتِ احتساب کو بے انتہا اختیارات حاصل تھے۔ وہ کسی کو قید میں ڈال کے مہینوں بلکہ برسوں بغیر مقدمہ سماعت کیے یونہی مقید رکھ سکتی تھی اور اسے اختیار تھا کہ سماعت سے پہلے نہ تو یہ بتائے کہ الزام کیا ہے اور نہ یہ کہ کس نے الزام لگایا ہے۔ آخر کو جب مقدمہ پیش ہوتا تو اسے صیغۂ راز میں چلایا جاتا تھا اور اگر کوئی قیدی اقبالِ جرم نہ کرتا تو ایسے عذاب دیے جاتے تو وہ بارہا مجبور ہو کر اپنا بیان بدل دیتا تھا۔ پھر کہا جاتا کہ یہ اقبالِ جرم وہ بلا جبر و اکراہ اپنی مرضی سے کرے لیکن اگر ایسا نہ کرتا تو پھر سخت تکلیفیں دی جاتیں اور ضرورت ہو تو بار بار یہی عمل جاری رکھا جاتا تھا۔ کبھی کبھی بے قصور مان کر مجرم کو رہا کر دیتے یا صرف اس قسم کی سزائیں دیتے کہ کسی ولی کی درگاہ میں جا کر تپسیا اور گناہ کا کفارہ ادا کرے یا یہ کہ زرد کرتہ پہنے اور سرخ صلیب گلے میں ڈالے پھرے جو گناہ سے تائب ہونے کی علامت تھی۔ سزائے قید کی کوئی خاص میعاد نہ تھی۔ چھ مہینے، سال بھر، یا دس برس یا عمر بھر قید میں رکھا جا سکتا تھا۔ اگر کسی مجرم کو موت کی سزا دی جاتی تو اہلِ کلیسا اسے حکومت کے حوالے کر دیتے اور وہ عدالت کے فیصلے کے مطابق مجرم کو مروا دیتی تھی۔

احتساب کے کسی قیدی کو فیصلہ سنانا اور سزا دینا بھی ایک "دینی کام" کہلاتا تھا اور باضابطہ رسوم کے ساتھ انجام دیا جاتا تھا۔ اس موقع پر بہت سے لوگ جمع ہو جایا کرتے تھے۔ جن کے لیے یہ بہت ہی ہنگامہ خیز تماشا ہوتا تھا۔ پندرھویں سولھویں صدیوں کے حالات میں ہم پڑھتے ہیں کہ بستی یا شہر کے بڑے چوک میں جوق در جوق مخلوق جمع ہو رہی ہے کہ اہلِ احتساب کا مقدس جلوس، جلو میں ملزمین کو آتا دیکھے اور عدالت کے فتوے کا پڑھا جانا

سُننے۔ تماشے کا پہلا منظر تو یہ ہوتا اور دوسرا وہ جب کہ فیصلے کے مطابق سزا دی جاتی تھی۔ یہ عموماً دوسرے ہی دن ہوتا۔ اور اس موقع پر بھی تماشائیوں کی بھیڑ لگ جاتی تھی شاہ فلپ دوم اکثر ان امور میں بہ نفسِ نفیس شرکت کرتے تھے۔ شہر ولا دولآ میں ہم اسی قسم کے مقدمے میں اس کی شرکت کا حال پڑھتے ہیں جب کہ ۱۸ آدمی الحاد کے جرم میں زندہ جلائے گئے۔ اسی طرح طلیطلہ میں، ایک مرتبہ جون کے مہینے میں ایک شخص کو جسے وجد وحال میں آنے اور غیب کی باتیں بتانے کا دعویٰ تھا، عدالت نے ایک سال قید اور سو کوڑے لگانے کی سزا دی تو یہ بادشاہ اپنے بچوں کو کوڑے لگنے کا تماشا دکھانے لایا تھا۔ ایسی ایذا دہی، شدید تکلیف اور موت سپین والوں کا ہمیشہ سے دل لبھاتی ہے جیسا کہ ان کا ادب، فنون اور تاریخ گواہی دیتے ہیں۔ ان میں تکلیف اُٹھانے کا اور ایسی دلیری دکھانے کا جو کسی کے دبائے نہیں دب سکتی، حیرت انگیز مادہ ہے۔ یہی صفات دوسری طرف انھیں اوروں کی تکلیف و اذیت سے بے پروا اور بے رحم و نا خدا ترس بنا دینے کی خاصیت میں ظاہر ہوتی ہیں۔

سپین کے سب سے پہلے صدر محتسب کا نام سنگ دلی اور ناروا داری میں ضرب المثل ہو گیا ہے۔ اس شخص مسمی توما دِ تورکوی مادا (Tomas de Torquimada) نے اشبیلیہ میں ایک دن کے اندر ۶ ہزار "مشتبہ یا ملحدانہ" کتابیں جلوا دی تھیں۔ وہ اٹھارہ برس صدر محتسب رہا اور اس مدت میں ایک لاکھ سے زیادہ ملزم اس کی عدالت میں پیش ہوئے۔ اہلِ تاریخ اس بارے میں اختلاف رکھتے ہیں کہ اس نے کتنے آدمی قتل کرائے۔ کم سے کم نوّے۔ مگر دوسری روایت میں ۴ ہزار اور دیگر مؤرخین کے ہاں اس سے بھی زیادہ یعنی نو ہزار کی تعداد آتی ہے۔ اس اختلاف کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بہت سے لوگ مواخذہ ہونے کی خبر پا کر سپین سے فرار ہو جاتے تھے۔ ان پر غیاب میں مقدمہ چلایا جاتا اور سزائے موت دیئے جانے کی صورت میں اُن کے پتلے جلائے جاتے۔

قانونی طور پر تو سپین کی عدالتِ احتساب ۱۸۳۴ء تک موقوف نہیں ہوئی لیکن مدت پہلے سے اس کا خوفناک پنجہ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ در اصل سترھویں صدی کے آخر میں اس کا اقتدار جاتا رہا اور اس کے بعد ہم صرف گاہ بہ گاہ ہی اس کا کوئی کارنامہ سنتے ہیں۔

باب نہم

فرانسیسی ملمّع: شاہانِ بوربون

جب خانوادۂ ہیپس برگ کا آخری بادشاہِ ہسپین، چارلس دوم فوت ہوا، تو ایک نیا خاندان بوربون وارثِ تاج و تخت ہوگیا۔ اس خاندان کا پہلا بادشاہ فلپ پنجم فرانس کے بوربون بادشاہ لوئی چہار دہم کا پوتا تھا۔ اس کی دادی ہسپانیہ کی وہ شہزادی تھی جس کے پرتکلف جہیز لاد کر فرانس لے جانے کا حال ہم اوپر سن چکے ہیں۔ غریب، کمزور فطرت چارلس کے کوئی اولاد نہ تھی لہذا فلپ کو بڑے وصیت جانشین بنایا گیا۔ تاہم ایک اور مدعی بھی اس کا حریف، آسٹریہ کا آرک ڈیوک (= شہزادہ) چارلس ہیپس برگ خاندان سے کھڑا ہوگیا کہ یہ اس خاندان سے جو دو سو برس ہسپین میں حکومت کرتا رہا، قریبی رشتہ رکھتا تھا۔

فلپ پنجم کی عمر تخت نشینی کے وقت سترہ برس کی تھی اور مقابلے میں آسٹریہ والے چارلس کے حامی انگلستان، آسٹریہ، ہالینڈ اور خود اسپین کا صوبہ قیطلونیہ آمادہ بہ جنگ تھے۔ البتہ فرانس قدرتی طور پر فلپ کی طرف تھا۔ جنگ بڑی نقصان رساں ثابت ہوئی اور ختم ہوئی تو اگرچہ فلپ کی بادشاہی سلامت رہی لیکن سپین کے یورپ میں کئی قیمتی مقبوضات ہاتھ سے نکل گئے اور سب سے بڑی ذلت یہ نصیب ہوئی کہ سپین کے سرے کی بیش بہا پہاڑی "جبل الطارق" انگلستان کے ہاتھ آگئی۔ وہ آج تک اُس پر قابض ہے اور ہسپانیہ کے قومی فخر کو برابر مجروح کر رہا ہے۔ قیطلونیہ نے فلپ سے صلح کر لی تھی مگر پہلے یہ صوبہ اپنے اندرونی معاملات میں آزاد تھا۔ اس کے یہ قدیم حقوق چھین لیے گئے اور قیطلونی زبان کا سرکاری معاملات میں استعمال بھی ممنوع کر دیا گیا۔

ہیپس برگ خاندان کے ایسے بادشاہوں سے جیسے فلپ چہارم اور چارلس دوم تھے نیا بادشاہ اس باب میں بہتر تھا کہ مالی حالات کو جو بہت ابتر ہو گئے تھے، اُس نے کچھ نہ کچھ درست کیا۔ پرانی سڑکیں پگ ڈنڈیوں سے کچھ ہی بہتر تھیں انھیں اچھی سڑکیں بنا دیا۔ پل تعمیر کرائے۔ میڈرڈ بہت گندہ کیچڑ بھرا شہر تھا، اس کی صفائی کرائی۔ بہت سی نئی خوبصورت عمارتیں بنوائیں۔ ان میں میڈرڈ کا شاہی محل اور ہسگوویہ سے چند میل پر لاگراں ژا (La Granja) کا دل کش قصر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ شہروں میں آوارہ گرد لوگوں کے جتھے فساد کرتے رہتے تھے۔ فلپ نے ان میں سے قابلِ جنگ اشخاص کو فوج میں بھرتی کرنے کا حکم دیا۔ بیمار، بوڑھے لوگوں کو ہسپتالوں اور محتاج خانوں میں بھجوا دیا۔

قصر لاگراں ژا کا اسکوریال کی بھیانک عمارت سے جسے فلپ ثانی نے بنوایا تھا، مقابلہ کیا جائے تو اسپین کے سابقہ بادشاہوں اور نئے بادشاہ کی طبیعت کا فرق معلوم ہو جائے گا۔ لاگراں ژا میڈرڈ سے کوئی ستر میل دور شمال مغرب میں فرانسیسی طرز پر بنایا گیا۔ یہ نواح پیرس کے مشہور محل ورسائی (Versailles) سے ملتا جلتا ہے بلکہ بعض لوگ اسے ورسائی سے زیادہ خوبصورت سمجھتے ہیں، کیونکہ ورسائی کے باغات سیدھی سپاٹ زمین پر ہیں اور لاگراں ژا کے سبزہ زار، خیاباں و چمنستاں جن میں کثرت سے فوارے اور جگہ جگہ خوبصورت پتلے بنے ہوئے ہیں، سایہ دار درختوں کے نیچے روشیں اور خوبصورت ترشی ہوئی تختاں دور تک چلی جاتی ہیں۔ انسان کی اس محنت اور صناعی کو گوادرمہ پہاڑوں کے قدرتی منظر نے اور زیادہ نمایاں کر دیا ہے کہ یہ خود رو چوٹیاں باغوں کے سامنے کھڑی آسمان سے باتیں کر رہی ہیں اور شروع گرمیوں میں بھی برف پوش رہتی ہیں۔

اسکوریال اپنی وسعت اور شان کے باوجود بڑی روکھی مقبرہ نما عمارت ہے۔ لاگراں ژا سے زندہ دلی اور اُنسیت ٹپکتی ہے۔ دونوں اپنے شاہی بانیوں کے مزاج کی خصوصیات کا نمونہ ہیں۔ فلپ پنجم کو اپنے پیش رو فلپ دوم کی طرح موت، بقائے دوام اور مذہبی جہاد کا خبط نہ تھا۔

نہ ان سابقہ ہسپینی بادشاہوں کی طرح متعصب تھا۔ چنانچہ اس نے عدالتِ احتساب کے کچھ اختیارات کم کر دیئے۔ مدارس کا احتساب نے گلا گھونٹ رکھا تھا۔ اس نے انھیں تازہ زندگی بخشی۔ تعلیم کے لیے لوگوں کو باہر جانے کی اجازت دی اور فرانس وغیرہ ممالک خارجہ کی کتابیں بھی اسپین میں لائی گئیں۔ دربار شاہی میں بیرونی اہلِ علم اور ظریفوں سے زندہ دل اہلِ ہسپین کو پھر میل جول کا موقع ملنے لگا۔ بایں ہمہ واضح رہے کہ یہ نئی نئی باتیں اور جدید خیالات عام باشندوں تک نہیں پہنچے۔ وہ اسی طرح پرانی ڈگر پر چلتے اور پرانے اوہام کے پابند رہے۔

ہم چاہیں تو اٹھارویں صدی کے ہسپین کو ایسے ظرف سے تشبیہ دے سکتے ہیں جس کے اوپر فرانس کی چینی کا ملمع اور اندر ہسپین کے مزاج کی وہی آہنی چادر تھی۔ یوں تو اس زمانے میں بہت سے لائق اہلِ قلم، نقاش، معمار ممتاز ہوئے لیکن فرانس کی مصنوعی طرزوں کی مصنوعی صیقل کو توڑ کر ہسپین کی اصلی ذہانت آگ کی لپٹ کی طرح باہر نکلی تو وہ صرف ایک نقاش فرانسسکو گویا کا کارنامہ تھی جس نے صدی کے اواخر میں زندگی کے نشاط و غم کے ہسپانوی جذبات کی گہرائی کمال صحت و قوت کے ساتھ دکھا دی۔

اگرچہ فلپ پنجم، اور اس کے دو جانشین بیٹوں نے مالیات کی ابتری کو دور کیا لیکن ان کی بیرونی حکمت عملی سے بہت جلد دوسری خرابیاں رونما ہوئیں کیونکہ انھوں نے قریب قریب ساری صدی ہسپین کو انگلستان، آسٹریہ، ہالینڈ اور پرتگال سے جنگ میں مصروف رکھا۔ ان کا دور ختم ہونے تک ہسپین، جزائر بلیارک و کینری کے سوا اپنے تمام یورپی مقبوضات کھو بیٹھا۔ انیسویں صدی آئی تو فلپ کا پوتا چارلس چہارم۔ بادشاہ اور نپولین بونا پارٹ کا، جسے ساری دنیا فتح کرنے کی ہوس تھی، مہیب سایہ چھایا ہوا تھا۔ چارلس کا عہد اور بھی تباہ کن اور ذلت آفریں نکلا کہ نپولین کو کوہستان پائی رین کے شمال میں روک دینے کی بجائے چارلس اور پھر اس کا بیٹا فردیناند اس سے سازشیں کرتے رہے یہاں تک کہ اس نے انھیں بے وقوف بنا کے ہسپین کو خود ہتھیا لیا۔ ساری روئیداد لالچ، حماقت، خباثت سے بھری ہے۔ لیکن اسے دلچسپ قصے کے طور پر آپ دیکھنا

چاہیں تو (نپولین کے سوا) اس کے دوسرے کرداروں کی حیرت انگیز تصویریں دیکھیے جنھیں گویا کے موقلم نے تیار کیا ہے۔ پراڈو کے مجموعے میں چارلس چہارم کی شبیہیں جو اس نے بنائی تھیں، آویزاں ہیں۔ بادشاہ، نہ صرف احمق اور انگھڑ معلوم ہوتا ہے بلکہ مرصع زیورات کی وجہ سے جو اپنے بھدے جسم پر جا بجا پہنے ہوئے ہے اس کا چھچھوراپن بھی عیاں ہے۔ پھر اس کی ملکہ ماریہ لو پر نظر کرو جس کی گاؤ دیدہ آنکھیں بالوں کے جھنڈ کے نیچے سے اُبلی پڑتی ہیں ـــ نپولین کا قول ہے کہ اس عورت کی سیرت اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی اور وہ ایسی تھی کہ کسی کو یقین نہیں آسکتا۔ ان کا بیٹا فردیناند تصویر میں لڑکا ہے لیکن گھٹیا، اُجبک آدمی کا چہرہ رکھتا ہے۔ اول اول سپین والے اسے "اِل دِسیدو" (بمعنی دل خواہ) کہتے تھے لیکن پھر یہی لقب تمسخر کا کلمہ بن گیا کیونکہ ایسے دنی الطبع بادشاہ کو کوئی قوم دل سے نہ چاہے گی۔ گویا کی قلم کاری کا آخری نمونہ ملکہ کے منظورِ نظر وزیر اعظم گودوے کی تصویریں ہیں۔ اس جاہ طلب شخص میں بھدی سی خوبصورتی ضرور تھی مگر چالاکی اتنی بھی نہ تھی کہ خاصا کامیاب وزیر ہی ثابت ہوتا۔ ان لوگوں کی صورتوں کا ولاس کوئز کی بنائی ہوئی فلپ چہارم اور اس کے گھر والوں کی تصاویر سے مقابلہ کیجیے کہ وہ بادشاہ، اس کی ملکہ اور بچے نیز اہل دربار کیسے باوقار، وجیہ اور سنجیدہ نظر آتے ہیں بخلاف بعد کے شاہی خاندان والوں کے جن کے چہروں سے رذالت اور بازاری پن ٹپکتا ہے ـــ حقیقت میں وہ ایسے ہی تھے۔ بلکہ نہ صرف نا مہذب بازاری بلکہ احمق بھی تھے۔ ہر ایک کو اپنی ذات کی فکر تھی اور ساز باز یا جوابی سازشوں میں مصروف رہتا تھا۔ آخر میں نپولین کی چٹکی میں پھنسے اور شاہ و ملکہ اور گودوے تو ساری عمر کے لیے ملک سے نکال دیے گئے۔ فردیناند پانچ سال تک ایک فرانسیسی قلعے میں عملاً قیدی رہا جب کہ نپولین کا بھائی سپین کے ڈگمگاتے تخت پر اپنے آپ کو سنبھالے رہا گر اہل سپین اسے زیادہ فحش گالیاں نہ دیتے تو بھی "پیپ بوتلاس" (یعنی بوتل مہاراج) کے نام سے پکارتے تھے کیونکہ وہ بہت زیادہ شراب پیا کرتا تھا۔

جس وقت نپولین دھوکے سے چارلس، فردیناند اور گودوے کو فرانس کی حدُود میں لایا قریب ستر ہزار فرانسیسی فوج پہلے ہی سپین میں پہنچ چکی تھی۔ ۲ر مئی ۱۸۰۸ء میں میڈرڈ میں افواہ پھیلی کہ نپولین نے شاہی خاندان کے باقی افراد کو بھی فرانس لانے کا حکم دیا ہے۔ ایک تیرہ سال کا شہزادہ ڈان فرانسسکو میڈرڈ سے جانا نہ چاہتا تھا۔ وہ جلا وطنی کی خبر سن کر زار و قطار رونے لگا۔ عوام نے جو یہ سنا تو گھوڑا گاڑی کے گرد جس میں شہزادہ جانے والا تھا جمع ہو گئے ــــ غضب ناک ہو کر انھوں نے جوت کی رسیاں کاٹ دیں اور گھوڑے کھول کرلے گئے۔ فرانسیسی سپاہیوں نے مجمع کو دھکیلا، گولیاں بلکہ گولے چلائے۔ عوام نے اینٹ پتھر، چھری لاٹھی سے مقابلہ کیا اور ایک ہسپانوی سردار نے قریب کی چھاؤنی سے ہتھیار لا دیے تو بندوقوں سے لڑے لیکن فرانس کی باقاعدہ فوج نے آخر یہ بلوہ فرو کیا اور اس کے سرغنہ نیز بہت سے اور بلوائیوں کو پکڑ کر فوراً گولی سے اُڑا دیا ــــ بایں ہمہ یہیں سے از سرِ نو اپنا ملک آزاد کرانے کی دوسری جنگ شروع ہوئی اور اِل دوس دِ مایو (= دوسری مئی) نے محبانِ وطن کو اُسی طرح ایک مقصد کے لئے متحد کیا جس طرح بہت پہلے (مسلمانوں کے مقابلے میں) کوآدونگا نے انھیں جمع کرنا شروع کیا تھا۔

۲ر مئی کے بلوے میں فرانسیسیوں نے جیسی وحشیانہ سفاکی سے لوگوں کو قتل کیا اس نے عام دہشت اور سراسیمگی پھیلا دی۔ اس حال کو دیکھنا ہو تو پراڈو میں گویا کے ہاتھ کی تصاویر دیکھیے۔ یہ مصور اور اس کا باغبان رات کو جنگ و خونریزی ختم ہونے کے بعد گھر سے نکل بھاگے تھے مگر گویا کے ہاتھ میں بندوق کے ساتھ نقشہ کشی کی بیاض بغل میں دبی ہوئی تھی اور بھاگتے میں بھی بادل چھٹ کر چاند نکل آتا تو وہ بندوق رکھ کر مقتولوں کے چہرے، اور جن کروٹوں سے گرے تھے، ان کی تصویریں اتارنے لگتا تھا۔ لاشیں کوچہ و بازار میں اور باہر کھیتوں میں پڑی تھیں انھیں دفن کرنے والا کوئی نہ تھا۔

یہ دوسری آزادیِ وطن (Re conquesta) کی جنگ سپین کے عوام کے سر پڑی۔

کوئی بادشاہ سربراہی کرنے والا نہ تھا۔موروِرے چند خاندانی امرا شامل ہوئے۔روپیہ پیسہ، سامانِ جنگ ان کے پاس نہ تھا۔فوج باقاعدہ کے دو چار دستے جو اُن میں آ ملے تھے انھوں نے شکست کھائی۔لڑنے والے زیادہ تر وہ رضا کار رہ گئے جن کی تدبیر جنگ، چھاپے مارنا، قزاقانہ حملہ کرکے فرار ہوجانا تھی۔ اسی سے اس کا نام (Guerre) جنگ سے (Gurrilla) یعنی چھوٹی جنگ (= قزاقانہ یا چپاولی جنگ) وضع کیا گیا ہے۔یہ لوگ نپولین کے آزمودہ کار سپاہیوں کو اسی طرح پریشان کرتے رہے اور آخر کار بیلان (جنوبی سپین) کے معرکے میں انھوں نے فرانس کی ۲۲ ہزار باقاعدہ فوج کو شکست فاش دی۔

اہل سپین کو بیلان کی فتح پر بڑا ناز ہے۔اسی طرح وہ سرقسطہ (Saragosa یا Zara) اور جِرونہ کے خوفناک محاصروں کا فخریہ تذکرہ سناتے ہیں۔حقیقت میں اِبرو ندی کے کنارے مٹیالے میدان میں بغیر فصیل اور دمدمے کے، شہر سرقسطہ نے دو مہینے تک دو دو محاصروں کا کس طرح مقابلہ کیا۔یہ عجیب کرشمہ یا خرقِ عادت واقعہ مانا جائے گا۔ بیلان میں شکست کھاکر فرانسیسیوں نے وسط اگست ۱۸۰۸ء میں پہلا محاصرہ اٹھالیا تھا کہ دوبارہ تیار ہوکر دسمبر میں حملہ کریں۔اس وقفے میں جزیرہ نما کے ہر علاقے سے جوق جوق رضاکار سرقسطہ کی مدافعت کے لیے آئے تھے: ارغون اور بلنشیہ کے کاشتکار، رسی کے تلے کے جوتے پہنے، رنگین رُمال سروں کو لپیٹے ہوئے۔قیطلونی جوان زرق برق پٹکے باندھے ہوئے، مرقیہ کے سانولے رنگ کے تلورئے میڈرڈ کے بانکے حسب معمول لمبی کرِچ کے ساتھ لمبے چغے پہنے ہوئے، سوئستانی جوانوں کا ایک دستہ جسے ارغون میں بھرتی کیا گیا تھا۔شاہی تفنگچیوں کی ایک جمعیت، غرض مدافعت کی تیاریاں ہوگئی تھیں۔ شہر کے آس پاس مٹی کے دھس کھڑے کرلیے گئے تھے۔بڑے بڑے آثار کی دیواروں کے گرجوں اور خانقاہوں میں اسلحہ، گولہ بارود ذخیرہ کیے تھے۔ گہرے تہ خانوں میں سامان خوراک جمع تھا، سرقسطہ والوں نے گرد و نواح میں اپنے زیتون کے باغ خود اکھاڑ ڈالے کہ دشمن ان کی آڑ نہ لے سکے

حالانکہ یہ قیمتی درخت برسوں میں تیار ہو کر پھل لاتا ہے اور سرقسطہ میں اور چیزوں کی اچھی فصلیں نہیں ہوتیں ـــــ تیاری مکمل تھی جب کہ فرانس کی پوری ۲۰ ہزار باقاعدہ فوج نے شہر پر حملہ کیا۔ ایک ایک کرکے فرانسیسی توپوں نے مٹی کے دھس، حفاظتی دیواریں منہدم کر دیں ـ کہیں ایک خانقاہ کا بازو ٹوٹ کر مدافعین پر گرا، کہیں کسی گرجا کی چھت اُڑ گئی۔ دیوار کے رخنوں میں لاشیں اڑائی گئیں۔ کہ مدافعت کچھ اور جاری رہے۔ ایک مکان ہاتھ سے گیا تو دوسرے مکان سے اہل شہر نے مقابلہ کیا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ایک ایک کمرے پر لڑائی ہوئی تاآنکہ مدافعین سب مارے گئے یا زخموں سے بیکار ہو گئے۔ کوچہ و بازار میدانِ کارزار بن گئے تھے۔ بڑے گرجوں کے اندر گھس گھس کر فریقین لڑتے تھے کہ کبھی منبر کے پیچھے سے فرانسیسی گولیاں مار رہے ہیں تو بغلی دالانوں اور تسبیح خوانوں سے سپینی جواب دے رہے ہیں۔ خانقاہی مدارس کی لڑکیاں گولہ بارود کے کارخانوں میں کام کرتی تھیں۔ ان کی ماں بہنیں زخمیوں کی مرہم پٹی میں ننوں کا ہاتھ بٹاتیں، مدافعین کو روٹی پانی ایسی چوکیوں میں پہنچاتی تھیں جو گولوں کی زد میں تھیں۔ بعض عورتوں نے شانہ بشانہ جنگ میں بھی حصہ لیا۔ اس دوسرے محاصرے میں پچاس ہزار اور ایک بیان کے مطابق ساٹھ ہزار مرد، عورت بچے مارے گئے یا زخموں اور وبائی بیماریوں سے ہلاک ہوئے۔ جس وقت فرانسیسی فوج شکستہ شہر میں فاتحانہ داخل ہوئی تو بے دفن و کفن مردوں کی ڈھیریاں ان کے راستوں میں لگی ہوئی تھیں۔

جِرونہ شہر پر بھی بہت کچھ یہی گزری جس نے سات مہینے کا محاصرہ جھیلا اور صرف اس وقت ہتھیار ڈالے جب فرانسیسی توپوں اور سرنگوں کو فاقہ کشی نے آبادی کے فنا کرنے میں مدد دی۔

سنہ ۱۸۰۸ـ۱۸۱۱ء کی ان لڑائیوں کو سپین کے لوگ "جنگ آزادی" کہتے ہیں۔ انگریزوں نے اسے جزیرہ نما کی جنگ کا نام دیا ہے۔ سپین کا پشتینی دشمن انگلستان اس جنگ میں مددگار بن کے آیا۔ اس نے ڈیوک اوف ولنگٹن کو فوج دے کر سپین بھیجا کہ فرانسیسیوں کو وہاں سے

نکالنے میں اعانت کرے۔ بالآخر نپولین نے سمجھ لیا کہ سپین و انگلستان کے بیڑوں نے مل کر اس کا منصوبہ چلنے نہیں دیا۔ "بوتل مہاراج" فرار ہو کر فرانس گئے۔ فردیناند ہفتم، شاہ دل خواہ واپس آیا اور لوگوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔

اس وطنی جدوجہد میں، جہاں تک ہمیں علم ہے، فرانسسکو گویا نے کوئی گولی نہیں چلائی۔ اہلِ وطن کی خفیہ کسی ٹولی میں شریک نہیں ہوا۔ تاہم اس زمانے میں قوم کے جوشِ مدافعت اور مصائبِ جنگ کی سب سے اچھی یادگار اس کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں۔ ایسا ہونا بھی چاہیے تھا کیونکہ وہ سرفروش سرقسطہ کے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر ایک ارغونی بستی میں پیدا ہوا تھا اور بیس برس کی عمر تک اسی شہر کے مصوروں کی شاگردی کرتا رہا۔ جنگ چھڑی تو وہ کئی سال سے میڈرڈ میں تھا۔ دو محاصروں کے درمیان کے وقفے میں سرقسطہ آیا اور یقیناً جو کچھ دیکھا، سنا اس کی تصویریں بنائیں یا خاکے یادداشت میں ٹانکے جن سے آگے چل کر وہ سلسلہ کندہ کیا جو مصائب جنگ کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ ۶۵ کندہ تصویریں نقاشی اور کھدائی کے کمال کی وجہ سے اہل فن میں بہت پسند کی جاتی ہیں لیکن ان کے خال و خط میں مصوّر کے غیظ و غضب اور دردمندی کے جو ناقابلِ فراموش جذبات جھلکتے ہیں انھیں دیکھنے کے لیے صاحبِ فن ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان میں سب سے مشہور تصویر کا نام "مردِ گلو افشردہ" ہے جس میں ایک پادری جسے گلا گھونٹ کر مارا گیا، دیوار سے لگا کھڑا ہے اور اس کی مٹھی میں صلیب کی ڈنڈی بھنچی ہوئی ہے۔ دوسری تصاویر میں بڑھتی ہوئی سنگینوں کا مرد و عورت سامنا کر رہے ہیں یا گولہ پھٹنے سے اِدھر اُدھر مر کر گرے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔

ان بغض و نفرت بھری تصاویر کے علاوہ چند اور کندہ کیے ہوئے سلسلے مصور کی طبیعت کا دوسرا رخ دکھاتے ہیں۔ دہمیات (Capri ichos) کے نام سے اسّی نقوش میں قوم کے اوہام اور عیوب کا، کبھی نرمی سے اور کبھی سخت تعریض سے، خاکہ اُڑایا گیا ہے۔ بحدّ د

مناظر میں بھوت پریت، چڑیلیں، نادان مرد، فضول گو بڑی بوڑھیاں، احمق لڑکے لڑکیاں راہب، راہبات، فوجی سردار، خاندانی امرا دکھائے ہیں اور واقعیت کے ساتھ تخیل کی آمیزش کردی ہے۔ ہر تصویر کے متعلق مصور کی رائے زنی موجود ہے۔ انہی وہمیات کے ایک منظر میں کسی سولی پر لٹکے ہوئے آدمی کے دانت ایک عورت اُکھیڑ رہی ہے۔ نیچے گویا نے لکھا ہے کہ "جادو چلانے کے لیے مصلوب کے دانت بہت کارگر ہوتے ہیں۔ اس جزو کے بغیر عمل کامیاب نہیں ہوتا — افسوس، لوگ کیسے کیسے خیالات خام میں مبتلا ہیں۔

Tauromaqura نام کے سلسلے میں سانڈوں سے لڑائی کی تصاویر، اگرچہ خوف انگیز نہیں، مگر عجیب عجیب کرشمے دکھاتی اور جوش پیدا کرتی ہیں۔ اس لڑائی کا خود گویا کو بہت شوق تھا اور اپنے بڑھاپے میں سنایا کرتا تھا کہ وہ جوانی میں میڈرڈ گیا تو سپین کے ساحل تک راستے کے قصبوں میں جگہ جگہ سانڈوں سے لڑکر اپنا سفر خرچ فراہم کیا۔ گویا کے باکمال نقاش اور کندہ کار ہونے میں شک نہیں۔ اس نے پردوں پر سپین کی زندگی کی بڑی دلآویز جھلکیاں ہمیں دکھائی ہیں، ان میں بانس پر چلنے والے، کھیت کاٹنے والے، سبزے پر بیٹھ کر تاش کھیلنے والے، سیب کے درختوں پر چڑھنے والے بچے — طرح طرح کے مناظر ہیں۔ ان میں سے اکثر شاہی کارخانۂ قالین بافی کے غالیچوں میں بنے جانے کے لیے بنائے گئے تھے۔ مزید براں بہت سی تصویریں خواتین و امرائے دربار اور ان کے بچوں کی ایسی اچھی اور مطابق اصل بنائی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ابھی یہ لوگ کسی کو پکارنے یا ڈانٹ ڈپٹ کرنے والے ہیں یا پینے کا گلاس طلب کرنے کو یا گویا کے فن پر کچھ کہنے کو ہیں — شوخ چشم حسین عورتیں، افسردہ بچے، رنگین مزاج یا مخمور جوان، سن رسیدہ افراد، جن کے چہروں سے ان کی سیرت عیاں ہوتی ہے — یہ سب اُس عہد کی معاشرت کو زندہ کردکھاتے ہیں۔ سپین کی اتنی وسیع اور بارونق دنیا کے ایسے مناظر سوائے سروِنتس کے اور کسی ہسپانوی شخص نے ہمیں نہیں دکھائے۔

باب دہم

چینی جھنجھنی ہے — آخری بوربون

۱۸۱۱ء میں فردیناند سپین واپس آیا تو صدہا محبانِ وطن جنھوں نے فرانس کو نکالنے میں جان کی بازی لگادی تھی، مارے یا قید کیے گئے کہ زیادہ روشن خیال حکومت اور آزادی کے طلبگار تھے اور فردیناند کو ان چیزوں سے نفرت تھی۔ شاید گویا کے موقلم کے ڈنک سے وہ ڈرتا تھا کہ اسے نہیں ستایا اگرچہ کہتے ہیں، ایک بار اس سے کہا کہ "تم نکال دیے جانے بلکہ سولی پر چڑھانے کے مستحق ہو لیکن صاحبِ فن ہونے کے باعث ہم تمھاری سب خطائیں بھلا دیں گے۔" اس نے کئی اور تصویریں بھی سامنے بیٹھ کر اتروائیں لیکن اس مصالحت کے باوجود ان دونوں کو ایسی بے اطمینانی رہی کہ آخر گویا نے فرانس چلے جانے کا فیصلہ کیا اور باقی زندگی خود ہی غریب الوطنی میں گزار دی۔

حقیقت میں سپین والوں نے فرانسیسی حملہ آوروں کے مقابلے میں جیسی بہادری دکھائی وہ اس بات کی سزاوار تھی کہ انھیں اچھے فرماں روا ملتے لیکن آئندہ دو بادشاہوں نے انھیں نصف صدی تک بڑے آزار دیے، فردیناند اور پھر اس کی بیٹی ازابلا (دوم) جو وارثِ تخت ہوئی دونوں نالائق تھے اور بادشاہ پرستی کا صلہ سوائے اس کے انھوں نے کچھ نہ دیا کہ خود نہایت جابرانہ حکومت کی اور رشوت خوار عمال مقرر کیے۔ ان بادشاہوں سے جبرًا رعایتیں لینے کی خاطر کئی بغاوتیں ہوئیں مگر بغیر کچھ بنائے دبا دی گئیں۔ مزید براں دو خانہ جنگیاں ملک میں برپا ہوئیں جو کارلوسی جنگیں کہلاتی ہیں کیونکہ یہ فردیناند کے سوتیلے بھائی ڈون کارلوس نے اور آگے چل کر ازابلا اور اس کے بیٹے الفانسو کے خلاف کارلوس کے وارثوں نے لڑی تھیں۔

ازابلا کو تو اہل اسپین نے بغاوت کر کے ملک سے نکال دیا اور اس کی بد اعمالیوں کی وجہ سے اس کے بیٹے الفانسو کو بھی قبول نہیں کیا بلکہ ایک اطالوی شہزادے کو بادشاہی کی دعوت دی۔ مگر دو سال تخت پر بے آرام رہنے کے بعد دوسری کارلوسی خانہ جنگی نے قوم کو آپس میں لڑا دیا، تو وہ خوشی سے بادشاہی چھوڑ کر اپنے وطن روانہ ہوگیا۔ اس کے چلے جانے پر جمہوری حکومت کی بنا ڈالی گئی تھی مگر یہ بھی نہ چل سکی تو الفانسو دوازدہم ہی کو واپس بلوایا۔ وہ ایسا پابندِ اصول بادشاہ تھا کہ حیرت ہوتی ہے لیکن بدنصیبی سے دس برس حکومت کر کے مر گیا اور جب تک بیٹا پیدا اور جوان ہو، اپنی بیوی کو مختارِ سلطنت بنا گیا۔ یہ بیٹا جو باپ کے مرنے کے بعد پیدا ہوا، الفانسو سیزدہم کہلایا۔

انیسویں صدی کے اوائل میں جب سپین نپولین سے کش مکش کر رہا تھا، پھر فردیناند کے عہد کی بدنظمی کے زمانے میں میکسیکو اور جنوبی امریکا کے ہسپانوی مقبوضات نے موقع پا کر آزادی کا عَلَم بلند کیا اور ۱۸۲۴ء تک جزائرِ فلپین، کیوبا اور پیورتو ریکو کے سوا سپین کے امریکی ممالک سب اس کے ہاتھ سے نکل گئے اور یہ جو رہ گئے تھے وہ بھی، خصوصاً کیوبا، سپین کی سخت گیر فوجی حکومت سے نالاں تھے۔ اُنھوں نے کئی دفعہ سرکشی کی اور ولایات متحدہ امریکا بھی ان کی طرفدار ہوگئی۔ ۱۸۹۸ء میں اس حکومت کا جنگی جہاز Maine کیوبا کی بندرگاہ ہوانا میں دھماکے سے اُڑ گیا تو وہاں کے اخباروں نے اصرار کیا کہ یہ سپین والوں کی شرارت ہے۔ اور عوام بہت برافروختہ ہوئے، حالانکہ ہنگامہ ٹھنڈا پڑنے کے بعد جو ہم غور کرتے ہیں تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ممکن ہے جہاز پر ہی کسی حادثے کی وجہ سے یہ دھماکہ ہوا ہو اور اس میں کسی تخریبی شرارت کا دخل نہ ہو۔ لیکن جہاز ڈوبنے کا اصل سبب جو بھی ہو، اس وقت تو یہ سانحہ کیوبا کے باغیوں کی طرف سے ولایات متحدہ کو سپین کے خلاف جنگ میں لانے کے لیے کافی ہوگیا۔ لڑائی سال بھر بھی نہیں رہی۔ ہماری (امریکی) فوجوں نے فلپین اور کیوبا کے سمندروں میں بحری فتوحات حاصل کیں اور خشکی کی لڑائیوں میں بھی حصہ لیا۔ سپین نے ہار مان لی اور

۱۸۹۸ء میں عہد نامہ پیرس پر دستخط ہو گئے جس نے کیوبا کو آزادی دلوائی، پیورٹو ریکو اور فلپین ولایات متحدہ کے حصے میں آئے۔

سپین والوں کو اس شکست سے نہایت صدمہ اور بڑی ذلت محسوس ہوئی۔ وہ اپنی سپاہ خصوصاً بحری فوج میں اسلحہ اور اس درجہ تیاری کی کمی سن کر حیران رہ گئے۔ تاہم بیرونی مقبوضات کی زیر باری سے بچا چھوٹنا غنیمت سمجھے، اور ان کے صاحب فکر اور ترقی خواہ افراد نے زور شور سے مطالبہ کیا کہ ملک میں اصلاحات کی جائیں تاکہ اس کی دنیا میں پھر توقیر بحال ہو۔ مختار کار حکومت ختم ہوئی اور الفانسو سیزدہم سولہ سال کی عمر میں بادشاہ بنا تو مستقبل امید افزا نظر آتا تھا۔ بادشاہ اچھے ارادوں کا، ہوشمند اور صاحب کشش نوجوان تھا۔ لوگ محبت کرتے تھے اور وہ بھی قوم کی بھلائی کا خواہاں تھا لیکن اس کی تربیت زمانے کے جدید تقاضوں کے مطابق نہیں ہوئی تھی اور اسے یہ نہیں سکھایا گیا تھا کہ اب کوئی بادشاہ اپنی ذاتی مرضی سے "تنہا جیسی چاہے حکومت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اہل ملک کو حکومت میں حصہ دار بنانے سے اس نے انکار کیا۔ اور لوگوں میں ناگواری اور تفرقے کا یہ بھی ایک بڑا سبب ہو گیا، مگر عام ناراضی کے اور اسباب بھی تھے۔ مثلاً باسک قوم کے صوبے اور زیادہ مقامی اختیارات چاہتے تھے۔ قیطلونیہ اپنی جداگانہ حکومت کا مطالبہ کرتا تھا۔ اِدھر فوج کی بادشاہ سے وابستگی اتنی بڑھی کہ پھر ملک میں فوج ہی کا عمل دخل ہو گیا اور آخر میں سپین کے نوسو جرنیلوں میں سے ایک شخص پریمو دِ رویرا (Premo de Rivera) نے سارا اختیار اپنے قبضے میں لے کر الفانسو کو محض شاہ شطرنج بنا دیا۔ رویرا لائق آدمی تھا اور اُس نے کئی اعتبار سے ملک کی حالت سنوار دی لیکن وہ بھی عوام کی اس خواہش کو کہ جمہوری طریقے اختیار کیے جائیں نہیں مانتا تھا، اس کی آمریت ناکام رہی اور اسے ملک چھوڑ دینا پڑا۔ اس کے چند روز بعد ۱۹۳۱ء میں الفانسو خاموشی سے تخت سے دست بردار ہو کر سپین سے رخصت ہو گیا۔ دوسری سپینی جمہوریہ بلا کشت و خون قائم ہو گئی۔ اس پر اول اول لوگ اتنے خوش ہوئے کہ جمہوریہ کو (La Nina bonita)

(= خوبصورت چھوکری) پکارتے تھے۔ مگر جب چھوکری بڑی ہوئی تو اس کی دل کشی میں فرق آگیا۔ برے لوگوں میں اُٹھنے بیٹھنے لگی ــــ ایسے انتہا پسند عناصر جیسے انارکسٹ، کمیونسٹ اور شوریدہ سر قیطلونی قوم پرست، روشن خیال (لبرل) گروہ میں آملے جنھوں نے شروع میں حکومت بنائی تھی۔ پھر طرح طرح کے جبر و جور نے اہل سپین کو ستانا شروع کیا۔ مثال کے طور پر مزدور جتھوں نے لوگوں کو اپنی موٹر خود چلانے کی ممانعت کردی اور قانون بنایا کہ جب تک ان کے جتھے کا شوفر ملازم نہ رکھا جائے مالک موٹر اس کا پہیہ نہیں چلا سکتا۔ لڑکیوں کو باغ میں پانی دینے کی ممانعت کردی گئی کہ یہ کام صرف جتھے (یونین) کے مالی کو کرنا ہوگا۔ مزدوروں کا دن منایا جاتا تو میڈرڈ، برشلونہ جیسے شہروں میں کوئی کرائے کی موٹر یا بس نہیں چلتی تھی اور ذاتی موٹر والے کی تو مجال نہ تھی کہ گاڑی سڑک پر نکالے۔

ان چھوٹی چھوٹی سختیوں نے لوگوں کو بہت تنگ کیا اور ان میں فرقہ بندی سے باہم مارپیٹ کی نوبت آئی، پھر ۱۹۳۴ء ہی سے سیاسی خون کیے جانے لگے اور گرجے جلائے جانے لگے۔ اسی سال استوریہ کے ضلعے میں کان کنوں اور دھات پگھلانے والوں نے اویدو کا پرانا شہر تاراج کیا حالانکہ گیارہ سو برس پہلے یہیں سے موروں کے خلاف جنگ کی موجیں بلند ہوئی تھیں۔ صرف وہاں کا ۷سو سال پرانا کلیسا جس میں سرکاری سپاہی مدد آنے تک ڈٹے رہے، بلوائیوں کی آتشِ غضب سے بچ رہا۔ جولائی ۱۹۳۶ء میں شمالی مراکش کے علاقے میں جو سپین کی سیادت میں تھا، فوج نے جمہوریہ سے بغاوت کردی۔ ہسپانوی سرداروں کے تحت مور سپاہی جبل الطارق کے پار اُترے اور انقلاب کا اعلان کردیا۔ کئی اضلاع کی مقامی فوج ان سے آملی۔ خانہ جنگی کا آغاز ہوا۔ باغیوں کی (جو بعض اوقات قوم پرست کہلاتے تھے) سپہ سالاری جنرل فرینکو نے سنبھالی۔ سرکاری فوجوں میں مختلف گروہ شامل اور جداگانہ مقاصد رکھتے تھے۔ ان میں ایسی وحدت نہ تھی جیسی باغیوں میں۔ مثلاً خوش عقیدہ کیتھولک فرقے کے باسک اور مذہب کے دشمن انارکسٹ اور اسی طرح قیطلونی جو "قشتالی اقتدار" سے بیزار اپنی مقامی آزادی کے والہ و شیدا تھے اور اُدھر کمیونسٹ کہ سپین کو متحد اور پیوستہ رکھنا اور پھر سوئٹ روس

کا طفیلیہ بنا دینا چاہتے تھے۔ یہ سب سرکاری فوج میں شامل تھے، انگلستان، فرانس، ولایات متحدہ نے اس خانہ جنگی میں کچھ دخل نہ دیا۔ لیکن روس کا سرکاری گروہ پر اقتدار بڑھتا گیا اور ادھر نازی جرمانیہ اور فاشستی اطالیہ نے جنرل فرانکو کو بہت کچھ مدد دی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اس خونناک خونریزی کے ذمہ دار بیرونی لوگ نہ تھے۔ یہ خود اہل سپین کی ضدی طبیعت اور زود حس خود پسندی کی وجہ سے شروع ہوئی جس طرح دوسری خانہ جنگیاں خود ان کی اپنی نااتفاقی سے ہوئی تھیں۔ ایک مصنف کا قول ہے کہ

> جنگ کا سبب یہ تھا کہ سپین کے مزاج میں حرارت زیادہ، رطوبت کم ہے۔ سپین کا گرم سورج وہاں کی سوکھی زمین کو جس میں پانی کی کوئی افراط نہیں ہے، تڑخا دیتا ہے۔ کوئی خیر خواہ اجنبی خود بھی سپین کے جوش جذبات کی رَو میں بہ کر کہتا ہے کہ سیدھے ہاتھ کا قطعہ تڑخن کا باعث ہوا" اور یا "بائیں طرف کا"۔۔۔ لیکن حقیقت میں وہ ساری زمین ایک ہے۔"

۱۹۳۹ء میں سرکاری فوجوں نے ہتھیار ڈال دیئے، خانہ جنگی ختم ہوئی۔ جنرل فرانکو نئی حکومت کا وزیر اعظم اور صدرِ مملکت بن گیا۔ اس وقت سے سپین میں کوئی جمہوری یا نیابتی حکومت نہیں ہے۔ وہاں کی (Cortes) یعنی پارلیمنٹ یا مجلس ملکی بھی محض قوانین تجویز کر سکتی ہے، منظور و نافذ کرنے کا اختیار نہیں رکھتی۔ سپین کا فاشستی گروہ "فالنگسٹ" موسوم ہے۔ یہ تعداد اور اثر میں سب سے بڑھا ہوا ہے۔ بہت سے شاہ پسند لوگ بھی ہیں جنھیں امید ہے کہ ایک دن پھر الفانسو کے بیٹے یا پوتے کو تخت پر متمکن دیکھیں گے۔ عوام کے دلی خیالات اور خواہش کی نسبت کچھ نہیں کہا جا سکتا، سوائے اس کے کہ وہ کشائش چاہتے ہیں۔ خانہ جنگی نے ابھی تک ان کو مضمحل کر رکھا ہے کیونکہ مشکل سے کوئی

گھرانہ ایسا ہوگا جس کا کم سے کم ایک فرد ضائع نہ ہوا ہو۔ ایسے قتل عام ہوئے کہ سُن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ دونوں فریق کے تقریباً آٹھ لاکھ نفوس سیاسی وجوہ سے ہلاک ہوئے اور کوئی چار لاکھ جنگ کے معرکوں میں کھیت رہے۔ بہت سے مقامات تباہ وتاراج کر دیے گئے۔ ہوائی گولہ باریوں نے اکثر بڑے شہروں کو کھنڈر کر دیا۔ پل برباد ہوئے۔ محلات، گرجے، خانقاہیں، دار العلوم خاک کا ڈھیر رہ گئے بعض بیش بہا تاریخی عمارات کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ باقیات جنگ کی ایک اثر انگیز یادگار طلیطلہ کا القصر (= بالاحصار) ہے۔ دو ہزار قوم پرست اور ان کے گھر والے یہاں ستر دن محصور رہے۔ بڑی سختیاں جھیلیں۔ بھاری آثار کا یہ قلعہ جس تباہ حال میں سرکاری فوج نے تسخیر کیا تھا، اسے یونہی رہنے دیا گیا ہے کہ دیکھ کر ایسی عبرت ہوتی ہے کہ کسی نئی یادگار بنانے سے یہ مقصد حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ اس شکستہ قلعے سے ایک پرانی روداد یاد آجاتی ہے اور آپ خیال کرنے لگتے ہیں کہ دو سانحے زمانے کے اعتبار سے بہت دور لیکن احساس کے اعتبار سے یکساں، اہل سپین کی نامتغیر فطرت کا کتنا واضح ثبوت پیش کرتے ہیں:- پہلا چھ صدی سے بھی زیادہ مدت کا سانحہ طریفہ میں پیش آیا۔ یہ (عربی نام کا) سپین کے انتہائی جنوب کا درخشندہ سفید شہر ہے دوسرا سانحہ طلیطلہ میں ۱۹۳۶ء میں گزرا۔ طریفہ کا قصہ الفانسو دِگزمان سے تعلق رکھتا ہے جسے Guzmanel. bueno (یعنی گزمان نیکو) موسوم کرتے ہیں۔ اور طلیطلہ کی داستان کا رستم کرنل جوآن موس کاردو ہے۔ جس طرح طریفہ کے قلعہ بند شہر کی حفاظت سانکو شاہ قشتالیہ نے اپنے باغی بیٹے کے مقابلے میں گزمان کے سپرد کی تھی، موس کاردو جنرل فرانکو کی طرف سے القصر کا محافظ سردار مقرر ہوا تھا۔ گزمان کا بھی ایک چھوٹی عمر کا لڑکا تھا اور موس کاردو کا بھی سولہ سال کا بیٹا لوئیس تھا۔ دونوں اپنے اپنے دشمنوں کے ہاتھ پڑ گئے۔ باغی شہزادے نے گزمان کو کہلا بھیجا

کہ اگر طریفہ کو حوالے نہ کرے گا تو اس کا بیٹا مار ڈالا جائے گا۔ موس کاردو کو محاصرہ کرنے والی جنگی پولس نے ٹیلی فون سے پیام دیا کہ اگر دس منٹ میں القصر کو ان کے حوالے کرنے کا اقرار نہ کرے گا تو لوئیس کو گولی سے اُڑا دیا جائے گا۔ طریفہ میں تو گزمان قلعے کی فصیل پر آیا اور اپنا خنجر پھینک کر پکارا کہ "لو اس خنجر سے کام لو" اور یہاں موس کاردو نے بیٹے کو ٹیلی فون پر بلایا اور جب اس کی آواز سن لی تو کہا: بیٹے اپنی جان خدا کے حوالے کرو۔ نعرہ لگاؤ "سپین زندہ باد" اور محب وطن کی طرح جان دے دو ـــــ دشمنوں نے گزمان کے بیٹے کو تو اس کے باپ کا خنجر گھونپ کر مارا اور لوئیس کو گولی سے اُڑا دیا۔

مرورِ زمانہ سے اہلِ سپین کی دلاوری میں کوئی فرق نہیں آیا، وہ ابھی تک عزت، ناموری، حبِ وطن پر ایمان رکھتے ہیں۔ البتہ اس بارے میں کہ ان چیزوں کو عمل میں لانے کی سب سے اچھی شکل کیا ہے، وہ متفق نہیں ہو سکے۔

باب یازدہم

بلندیوں پر

سپین والوں سے بڑھ کر یورپ کی کسی قوم نے بڑے بڑے قلعے، گرجے اور خانقاہیں تعمیر نہیں کیں۔ نہ اور کسی ملک میں اتنے قدیم شہر آپ کو نظر آئیں گے۔ ان میں سے بعض جیسے بلنشیہ، برشلونہ اب جدید ہو گئے ہیں۔ پھر بھی ان میں زمانہ ماضی کی عمارتیں بلکہ محلّے کے محلّے محفوظ ہیں۔ دوسرے پرانے شہر مدت سے ترقی کرنے سے رُکے رہے۔ یہ عام طور پر کسی پہاڑی کے اوپر اس طرح سکوت میں ہیں جیسے کوئی حسینہ عہد گذشتہ کے خواب دیکھ رہی ہو۔ ملک میں وسطی "میستہ" (Maseta) = سطح مرتفع ، خصوصیت سے ان پرانے شہروں کا خزانہ ہے جو صدیوں سے جیسے تھے ویسے ہی رہے، گویا خواب میں ہیں اور یا حال ہی میں ہوشیار ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر آوِلہ ہے کہ آپ سولھویں صدی کی گہرائی میں غوطہ لگانا چاہیں تو اس شہر کی سیر کریں جس کی گول فصیلیں اور برج اور بڑے دروازے ٹھیک اسی طرح سلامت ہیں جیسے آٹھ سو برس پہلے تھے۔ یہ سمندر کی سطح سے کوئی پون میل اونچا ہے۔ روشن فضا میں پکائی ہوئی مٹی کی چھتیں آسمان کی جانب لپکتی معلوم ہوتی ہیں۔ بسد سورما کے آقا، الفانسو ششم نے موروں سے لینے کے بعد اس کے برج دوبارہ بنانے شروع کئے تھے۔ اس کا کلیسا بھی انھی قلعہ بندیوں کا جز بن گیا ہے، کیونکہ اس کی عقبی دیوار فصیل کے ساتھ نیم دائرہ بنا کر ایک برج بن جاتی ہے۔ اور اس کے دریچوں میں شگاف چھوڑ دئیے گئے ہیں جن میں سے تیر انداز

اور بند دقچی کسی حملہ آور کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔ ممکن ہو تو آوِلہ کی سیر مئی یا پھر ستمبر کے مہینے میں کیجیئے کیونکہ گرمی میں شہر تپتا ہے اور سردی میں سخت جاڑا پڑتا ہے۔ گرمیوں میں کلیسا کے تاریک اندرونی حصے البتہ تہہ خانوں کی طرح خوب ٹھنڈے رہتے ہیں۔ ایسٹر کے دنوں میں اکثر موریوں کا پانی تک جم جاتا ہے اُدھر اکتوبر میں پہاڑ کی برفانی ہوائیں، شہر کے چھوٹے چھوٹے چوک اور تنگ گلی کوچوں میں سرسراتی ہیں لیکن مئی یا ستمبر کے صاف دنوں میں آوِلہ ایک جادو کا شہر معلوم ہونے لگتا ہے جب کہ دھوپ خانقاہ کی چوڑی دیواروں کو چمکاتی اور بڑی بڑی، خاصی ڈراونی حویلیوں کے پھاٹکوں کے اوپر خاندانی نشانات کو جِلا دیتی ہے۔ اِن میں سے بعض حویلیاں اب ڈھنڈر ہو گئی ہیں۔ ان کی چار دیواری کے اندر مکانات کے خالی ڈھانچے کھڑے ہیں۔ در و دیوار پر گھانس اُگ آئی ہے۔

آوِلہ میں بہت سے نامی اسپین والوں کی روحیں گشت لگاتی ہیں۔ فردیناند اور ازابلا کا اکلوتا بیٹا جوآن اور اسی طرح وہ ظالم صدر محتسب، تورکوے میدا یہاں مدفون ہے۔ اس بادشاہ اور ملکہ نیز چارلس پنجم اور فلپ دوم کی بہت سی حکایتیں اس شہر سے وابستہ ہیں کہ یہ فرماں روا مدتوں یہاں مقیم رہے تھے۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر یہ ٹریسا ولیہ کا گھر ہے جس کی باطنی حکومت ابھی تک قائم ہے۔ یہ نہایت دل کش شخصیت تھی اور اس کی زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی بات سولھویں صدی کے ہسپینی افکار و روش کی تصویر دکھاتی ہے۔ وہ اپنے زمانے اور اہل وطن کا بہترین نمونہ ہونے کے باوجود ایک جداگانہ شخصیت ایسی بھی رکھتی ہے کہ اسے فراموش نہیں کر سکتے۔ وہ آوِلہ کی فصیل کے سایے میں ایک اندھیرے گھر میں اس وقت پیدا ہوئی جب کہ غرناطہ کی فتح کو ۲۳ برس یا اور بھی کم مدت گزری تھی۔ بچپن

سے فتوحاتِ جدید کی کہانیاں کان میں پڑیں۔ سات برس کی تھی کہ اپنے ۱۱ سالہ بھائی کے ساتھ گھر چھوڑ کر بھاگی کہ شمالی افریقہ جاکر موروں کے ہاتھ سے شہادت حاصل کرے۔ کیونکہ بھائی بہن کے ذہن میں سیدھے جنت میں جانے کا یہی طریقہ تھا۔ مگر شمالی افریقہ کے راستے وہ جنت کے سفر میں شہر کے سامنے کی سڑک تک ہی جاسکے کیونکہ وہاں ان کا چچا مل گیا اور وہ دونوں کو گھر لے آیا۔

ثریسا بڑی ہوکر خوبصورت دوشیزہ ہوئی تو اچھے کپڑے پہننے اور مزے سے وقت گزارنے کی شائق تھی اور اول اول راہبہ بننے کا کوئی میلان نہ رکھتی تھی لیکن سولھویں صدی کے مذہبی جوش نے اس کے دل نشیں کردیا کہ نجات کا ذریعہ صرف عزلت نشینی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ آویلہ کی بہت سی خانقاہوں میں سے وہ ایک میں داخل ہوگئی۔ اس کی زندگی کے کئی مختلف پہلو ہیں۔ اس پر وجد یا بے خودی کے دورے پڑتے تھے اور ان میں شیاطین و اولیاء دونوں کے خوفناک اور دلکش خواب دیکھتی تھی۔ اسی کے ساتھ اتنی ہوشمند تھی کہ اگر کوئی اس حالت میں اسے مدہوش اور اکڑے ہوئے پڑا ہوا دیکھ لیتا تو بہت شرماتی تھی۔ اکثر بیماری سے درد و تکلیف میں مبتلا رہتی مگر خوش مزاجی بلکہ ہنسی ۔ لگی میں فرق نہ آتا۔ دعا کیا کرتی تھی کہ "خدا مجھے بدخو ولیوں سے بچائے۔"

وہ جس خانقاہ میں داخل ہوئی وہاں تیس برس سے زیادہ گزار کر، ۵۷ برس کی عمر میں اسے چھوڑ دیا کہ ایک اور خانقاہ خود بنائے اور اس میں زیادہ زہد و ریاضت کی زندگی اور سخت قاعدوں کی پابندی کرائی جائے۔ ایسی ایک خانقاہ قائم کرنے کے بعد پھر اس نے گشت لگانے شروع کیے اور سپین کے سبھی اضلاع میں کوئی تیس خانقاہیں بسا دیں۔ وہ لکھتی ہے کہ "مجھے سفر، خاص طور سے لمبے سفر سے نفرت ہوگئی تھی:" اس کا سبب ظاہر ہے کہ برابر سفر کرتی رہی، اپنی تحریروں میں بھٹنوں، پسوّوں اور خراب راستوں پر وہ اور ساتھ والی راہبات دھڑا دھڑ کرتی

بند گاڑیوں میں سفر کرتی تھیں۔ لکڑی کے ٹھوس پہیے ہوتے تھے۔ اور کمانیوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ گرمی اس قیامت کی ہوتی کہ ساج اور لونڈر کا عرق تک خشک ہوجاتا تھا، حالانکہ یہ گرم و خشک بنجر زمین کی جھاڑیاں ہیں۔ اسی طرح سردیوں میں سفر ہوتا تو ٹھٹھر سے بچاری عورتوں کے ہاتھ پاؤں اکڑ جاتے تھے۔ ندی ناوں کو پار کرتے وقت کبھی کبھی ڈوبنے کی نوبت آجاتی۔ پہاڑی بلندیوں پر بارہا قریب ہوتا کہ گاڑیاں لڑھک جائیں۔ راستے کی سرائیں اس قدر گندی ہوتیں کہ وہ اکثر اپنی گاڑیوں میں رات بسر کرنے کو ترجیح دیتی تھیں۔ بارہا پینے کا پانی ختم ہو جاتا، کھانے کی چیزیں جو ساتھ ہوتیں، سڑ جاتیں۔ اور ایسا بھی ہوتا کہ راستے میں کوئی کھانے کی چیز، ایک انڈا تک انھیں خرید کر کھانے کو نہ ملتا تھا۔

آوِلہ میں لوگ ایک ایک خانقاہ دکھاتے ہیں، جہاں ٹریسا پڑھنے جاتی تھی۔ جہاں بیعت کر کے راہبہ بنی، جو اس نے بنوائی اور پھر ایک اپنے خاندانی مکان کی جگہ پر تعمیر کرائی۔ اس کے اقوال، کرامتیں اور ذاتی خوبیاں آج تک شہر میں دہرائی جاتی ہیں۔

سطح مرتفع پر دوسرا شہر جہاں ماضی کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے، سِگوویَہ (سقوبیہ) ہے۔ یہ آس کی زمین سے بھورے بادل کی طرح اٹھتا ہے۔ یا بڑا جہاز سمجھیے جس کا پیش القصر اور دنبالہ رومیوں کا تالاب ہے۔ یہ عظیم ذخیرۂ آب رومن قیصر تراجن نے اس خوبی سے بنوایا تھا کہ اس کی نہر دس میل دور کے پہاڑوں سے اٹھارہ سو سال سے برابر پانی لاتی اور برابر پہنچاتی ہے۔ تیرھویں صدی کا شاہ قشتالیہ الفانسو "العاقل"، برجوں اور کنگوروں کے قلعے القصر میں آکر اکثر قیام کرتا اور گھنٹوں اپنی کتاب "تاریخ عامہ" لکھتا رہتا تھا۔ یہ اس کی مشہور تاریخِ سپین دنیا کی آفرینش سے شروع ہوتی، اور اس کے باپ شاہ فردیناند سوم کے زمانے تک آتی ہے۔ پرانے گرجے دیکھنے کا شوق ہو تو سگوویہ میں کوئی بھی گرجا ۶ سو سال سے کم کا نہیں سوائے ایک کلیسا کے

سو یہ فوارہ بھی سولھویں صدی میں بنا تھا۔

روے دِیاز المعروف بہ "سِد" کا شہر برغس (Burgos) ہے۔ جہاں اس کی ولادت گاہ کی جگہ دکھاتے ہیں۔ وہ یہیں خوش نما کلیسائے برغس میں بیاہا گیا اور میاں بیوی دونوں کی قبریں اسی کے ایک عبادت خانے میں بنی ہوئی ہیں۔ وہ صندوق بھی ابھی نمائش کے لیے رکھا ہے جسے دکھا کر اس نے اپنی جلا وطنی کے وقت ساہوکاروں سے بہت سا روپیہ لیا تھا اور ان سے کہہ دیا تھا کہ یہ صندوق زر و جواہر سے بھرا ہوا ہے، حالانکہ اس میں ریت بھری تھی۔ اور جہاں تک معلوم ہے آئندہ بہت سی فتوحات حاصل کرنے کے بعد بھی اس نے ان ساہوکاروں کا قرضہ نہیں ادا کیا۔

سپین کے کثیر التعداد خوبصورت گرجوں میں کلیسائے برغس کلاں ترین عمارتوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی برجیاں فضا میں گل بوٹوں کی طرح اُبھری ہوئی ہیں اور اندرونی حصے میں سونے پیتل کا کام، نفیس آہنی جالیاں، مورتیاں اور اعلیٰ درجے کے چوبی نقش و نگار نے اسے قابلِ دید اور آرائش سے مزین کر دیا ہے۔

دارالعلوم والا سلاآمانکا ایک اور دلکش مقام ہے۔ تورمس ندی کے پاس سے نظر کیجیے، تو تین نیچی پہاڑیوں پر اُس کی سنہری فصیلوں، برجوں اور چھتوں کا یک طرفہ نقشہ نہایت نظر فریب ہوگا۔ قدیم سلاآمانکا کا صرف نصف حصہ رہ گیا ہے، دوسرا نصف نپولین کی فوج نے برباد کر دیا جس میں شہر کی ۲۰ میں سے ۱۳ خانقاہیں اور ۲۵ میں سے ۲۰ درسگاہیں بنی ہوئی تھیں۔ فنِ تعمیرات کے دلدادہ ان کے ضائع ہو جانے پر آج تک ماتم کرتے ہیں۔ جو عمارتیں سلامت رہیں وہ نہایت خوبصورت ہیں۔ اسی سے لوگوں کو قلق ہوتا ہے کہ پورا شہر اصل حالت میں کیسا کچھ بے بہا ہوگا۔ شہر کی عمارتیں ایسے پتھر سے بنی ہیں کہ کھدانوں سے نکلتے وقت پنیر کی طرح نرم ہوتا

تھا کہ سنگ تراش اس پر بے تکلف نہایت باریک و نفیس نقوش بنا سکتے تھے.
جو قالین کے گل بوٹوں سے یا کوفت کاری سے جیسی آجکل چاندی پر کی جاتی ہے،
مشابہ تھے۔ دارالعلوم کی عمارت بھی اسی طرح کے دائروں، طغروں اور بیلوں سے ایسی
آراستہ ہے کہ وہ پتھر کا ایک مرصع زیور بن گئی ہے۔ ہوا میں رہنے کے بعد یہ پتھر
سخت اور زردی مائل ہوتا چلا جاتا ہے اور بالآخر اس میں طلائی رنگ کی دیرپا خوبصورتی
آجاتی تھی۔ سلامانکا کا دارالعلوم سپین میں سب سے قدیم اور یورپ کی بھی قدیم ترین جامعات
میں سے ایک ہے۔ قرون وسطیٰ میں بہت سے نامی اہل علم یہاں آئے ہیں۔ پندرھویں اور
سولھویں صدی میں اس کے افکار احتساب کی گرفت میں رہے اور یہاں کے اساتذہ کو
یہ نازیبا شہرت نصیب ہوئی کہ انھوں نے کلمبس کے خیالات کا جو زمین کے گول ہونے کا
قائل تھا، مضحکہ اُڑایا اور اصرار کیا کہ جب بائبل دنیا کو چپٹا بتاتی ہے تو اسے گول سمجھنا الحاد
میں داخل ہے۔ ممکن تھا کہ وہ کلمبس کو احتساب کی دار و گیر میں مبتلا کرا دیں لیکن شہزادہ
جوآن کے اتالیق کا اعتماد اور پشت پناہی اس کے آڑے آگئی۔ اپنے زمانۂ عروج میں
اس دارالعلوم کے ایوانوں، محراب دار دالانوں یا سرو و صنوبر، بلوط اور دیودار کے
سائے میں دس ہزار طلبہ کا مجمع رہتا تھا۔ محراب دار دالانوں کا سلسلہ شاندار
صدر چوک کے گرد پھیلتا چلا گیا تھا اور ایسے محرابی دالانوں میں سپین کا ایک جمیل ترین سلسلہ
شمار ہوتا ہے لیکن اب طلبہ بہت کم رہ گئے ہیں اور اسی علاقے کے لڑکے لڑکیاں
پڑھنے آتے ہیں۔ بیرونی ممالک کے طلبہ کے لیے گرمیوں میں درس دینے تک کا سلامانکا
میں انتظام نہیں جیسا کہ برغس، میڈرڈ وغیرہ، دوسری جامعات میں کر لیا گیا ہے۔

سلامانکا کی نواح میں بہترین لڑائی کے سانڈ بھی تیار کیے جاتے ہیں اور گزشتہ
زمانے میں کسی خاص واقعے کی یادگار میں جب یہاں ایسی لڑائیاں دکھائی جاتیں تو اکثر
صدر چوک (Plaza Mayor) کے راستے بند ہو جاتے تھے۔ وہ منظر بھی عجیب و غریب

اور کسی گویا کی قلم کاری کے لائق ہوتا ہوگا جب کہ گرد و پیش خوشنما عمارتوں کے آہنی جنگلے اور جھروکے ریشم و دیبا کی لہراتی جھنڈیوں سے چوک رنگ برنگ کے فاخرہ لباسوں سے ایک عید کا سا سماں دکھاتا تھا اور تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ زبردست سانڈوں اور ان سے لڑنے والے بہادروں کو تحسین و آفریں کے نعروں سے داد دیتے تھے۔

شہر طلیطلہ کا جادو سب سے بڑھ کر رات کے وقت جاگتا ہے۔ آپ جتنی دیر میں یہاں پہنچیں، اور جس قدر اندھیری رات ہو اسی قدر آپ زیادہ مسحور ہو جائیں گے۔ جب آپ کی موٹر راستہ ٹٹولتی ہوئی کوئی پل پار کرتی ہوگی تو نیچے بہتے ہوئے ٹیگس کے کالے پانی میں روشنیوں کا عکس ٹمٹماتا اور سر پر چھائی ہوئی پہاڑیوں سے مل کر طرح طرح کے نقش بناتا دیکھیں گے۔ موٹر سلامی دار بلندی پر چڑھے گی جس کے ایک طرف کالی کالی پہاڑیاں نکیلی چٹانوں کی طرح کھڑی ہیں اور دوسری طرف مکانات کی چھتیں بل کھاتی چلی گئی ہیں جیسے خواب میں موجوں کا مد و جزر نظر آتا ہے۔ موٹر چڑھتی چلی جائے گی، چڑھتی چلی جائے گی اور یکایک ایک کھلے چوک میں آکر ٹھیرے گی جو اچھی طرح روشن نہیں ہوگا۔ اور آپ غنودگی میں گرتے پڑتے ایک ہوٹل میں پہنچ جائیں گے۔ دوسری صبح دریچے سے شہر پر نظر جائے گی تو رات کا جادو قائم رہے گا۔ سرخی مائل چھتیں جن کے گچھے کے گچھے کلیسا کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں دل میں یہ احساس پیدا کیے بغیر نہ رہیں گے کہ ان کے نیچے ضرور طرح طرح کے بھید چھپے ہوئے ہیں۔ اگر آپ کو فرصت ملے تو سنگ بستہ تنگ گلی کوچوں کی بھول بھلیاں میں پڑے پھریں، اور کسی "دور باش" کہنے والی حویلی کی ڈیوڑھی سے اندر کی طرف بھی جھانک لیجیے تو عجب نہیں آپ کو خانہ باغ طرح طرح کے پھولوں سے ایسا شگفتہ نظر آوے کہ آپ حیرت زدہ ہو جائیں۔ شاید آپ کسی گرجا کے سامنے کے چھوٹے سے چھپے ہوئے چوک میں جا نکلیں جہاں آپ کو عورتیں اپنے گھڑے گھڑولوں میں پانی بھرتیں اور چپڑ چپڑ باتیں کرتی ملیں گی۔ کبھی کبھی کوئی کاشتکار اپنے گدھے پر قریب سے

گزرے گا جس کے سوتی پالان پر ترکاریاں یا ایندھن یا مٹی کے برتن یا کھانے کا تھیلا لدا ہوگا۔ ممکن ہے اسی گشت میں دو قدیم یہودی صومعوں میں سے کسی ایک پر آپ کا گزر ہو۔ اگرچہ انھیں تقریباً چھ سو سال سے کیتھولک گرجا بنا لیا گیا ہے۔ تاہم آج بھی یہودیوں کی روحیں یہاں منڈلاتی معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک سنتا ماریہ لا بلانکا کا گرجا کہلاتا ہے اور دوسرا "ال ترانزتو" موسوم ہوگیا ہے۔ کتاب "سپین" (طبع لندن ۱۹۵۲) کا مصنف (Sitwell) لکھتا ہے کہ ال ترانزتو ایک بڑا ایوان ہے جس میں بغلی دالان بنے ہوئے نہیں بلکہ ایوان کی دیواروں ہی کو کاٹ کر دریچے نکالے اور استر پر آرائشی خانے بنائے ہیں جن میں عبرانی تحریر کے کتبے ہیں۔ دوسرے گرجا سنتا ماریہ کی کمانیں نعل نما، دیواروں پر عربی نقش و نگار، ..... ستون سفیدی کیے ہوئے ہیں۔ ہم تصور میں اس کے بانی سیمیول ہوی کو دیکھ سکتے ہیں کہ سرخ ڈاڑھی اور لمبے لبادے میں..... نجومی سا نظر آتا ہے۔ غلام گردشیں یہودنوں سے بھرتی جا رہی ہیں، جن کے سر کی پوشش پیچ در پیچ اور عجیب طرح کے لباس ہیں۔ جو چار صدی بلکہ زیادہ مدت سے سپین میں نہیں دیکھے گئے تاہم سفر دیم یعنی یہود کی کتاب فقہ یا شریعت میں ان کی نشانیاں اِدھر اُدھر مل سکتی ہیں۔

کلیسائے طلیطلہ کی، ظاہر ہے کہ آپ ضرور سیر کریں گے کہ سپین کے سب سے دلچسپ معابد میں شمار ہوتا ہے اور تصاویر، سنگ تراشی، خوشنما قبور، سونے چاندی کے ظروف، زر و جواہر سے مرصع، کلیسا کے پردوں کا بہت بڑا خزانہ ہے۔ (یہ بیش بہا پردے، بعض اوقات پرانے بادشاہوں کے ملبوسات سے بنائے گئے تھے) یہاں کی کسی نماز میں شرکت کا اتفاق ہوجائے تو آپ کو اہلِ کلیسا کا لباس فاخرہ میں جلوس بنا کر، ارگن باجے کے تال سُر پر آہستہ آہستہ اس عظیم عمارت کے بغلی دالانوں سے پیچ کھاتے ہوئے زاویوں کے سامنے سے، جو آہنی جالیوں کے پیچھے مستور ہیں، بڑھنا کبھی فراموش نہ ہوگا۔ شہر

میں آپ مصور ال گریکو کا مکان بھی دیکھیں. یہ سادہ چند کمرے کا مکان اور اس کا پہاڑی باغ بلندی پر بنے ہیں جس کے نیچے طلیطلہ کا نشیبی حصہ ہے۔ اس کے سامنے کھڑے ہوکر، چھتوں کے پار دریا تک نظر دوڑائیے تو اس مٹیالے شہر کا اس تصویر سے مقابلہ کرسکتے ہیں جو اب سینٹ روپالیٹن میوزیم (نیویارک) میں آویزاں ہے اور جس میں تصویر کشی کیسی ہی بھیانک اور نامانوس کرتا ہو، اس مکان میں زندگی خاصی طرح خوش باشی کی بسر کرتا اور اپنے زمانے کے مشاہیر کی یہاں مدارات کیا کرتا تھا۔ لوپ وڈگا بارہا اس کا مہمان رہا اور سروینتس بھی جو طلیطلہ میں بہت گھٹیا سرائے میں رہا کرتا تھا، کہا جاتا ہے کہ اس سے یہاں ملنے آیا تھا۔ یہ سرائے پچھلی خانہ جنگی ہی میں منہدم ہوئی ورنہ ہمارے زمانے تک اس میں کچھ فرق نہیں آیا تھا اور وہ اسی حالت میں تھی جس میں سروینتس بالائی منزل کے برآمدوں میں کھڑے ہوکر دہقانی قسم کے جوڑے چکلے مسافروں کو نیچے گرد و غبار یا کیچڑ بھرے صحن سے سرائے میں آتے دیکھا کرتا ہوگا۔ کوٹھے کا یہ برآمدہ پورے صحن کے گرد بنا ہوا ہے۔ نیچے سرائے میں آنے والے مسافر کبھی خچروں کے تنگ کھولتے نظر آتے۔ کبھی کوئی فوجی سوار گھوڑے سے کود کر اترتا۔ کبھی تاجر اپنے اسباب سمیت رہزنوں کی دست برد سے بچ کر صحیح سلامت شہر میں پہنچ جانے پر خدا کا شکر کرتے ہوتے تھے۔ سرائے کا نام Posado de la Sangre (یعنی خون کی سرائے) تھا اور اب اسے دوبارہ اسی صورت میں بنا دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے جیسی وہ پہلے تھی۔ تاہم شاید آپ کو طلیطلہ کی ایک اور نامی عمارت القصر یاد آئے جو اسی جنگ میں زخم کھا کے گری تھی، سو اسے جنگ کی یادگار کے طور پر اسی ویران و شکستہ حالت میں رہنے دیا جائے گا۔

باب دوازدہم

میڈرڈ

سپین کے شہروں کی تاریخ پر نظر کیجیے تو میڈرڈ کوئی پرانا شہر نہیں ہے. سولھویں صدی تک گمنام سا گاؤں تھا۔ حتیٰ کہ فلپ دوم نے جزیرہ نما کے وسط میں ہونے کی وجہ سے اسے بہت کار آمد سمجھا اور اپنا پایہ تخت بنا لیا۔ لیکن اس کی توجہ قصر اسکوریال بنانے پر رہی جو یہاں سے تیس میل پر تھا اور میڈرڈ کو زیادہ ترقی نہ دے سکا۔ اس کے ہیبس برگ جانشینوں نے یہاں زیادہ سکونت نہیں رکھی۔ البتہ اٹھارویں صدی میں فلپ پنجم کے وقت سے بوربون بادشاہوں نے بڑے پیمانے پر یہاں عمارتیں بنوائیں اور پائے تخت کی شان بڑھائی۔ من زنارس ندی کے کنارے، جو چوکور محل بڑی آن بان سے ابھرا نظر آتا ہے اسے فلپ نے بنوایا تھا۔ بایں ہمہ آئندہ صدی میں بھی میڈرڈ کا بڑا حصہ تنگ گلی کوچوں کا مجموعہ تھا۔ جس کے مکانات عام طور پر پست و حقیر، صحن چھوٹے اور تاریک تھے، کہ شہر کے پرانے حصوں میں آج بھی وہ نمونے آپ دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ سو برس پہلے ہر اخبار نویس پائے تخت میں ہر جگہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر اور حکومت کی بے پروائی پر طعن تعریض کیا کرتا تھا لیکن جدید میڈرڈ جس کی آبادی ۱۵ لاکھ سے زیادہ اور رقبہ بھی پچھلے تیس برس میں سہ گنا ہو گیا ہے، نہ صرف سپین کا سب سے بڑا شہر ہے بلکہ صاف ستھرا، باوضع اور تیز پا بھی ہے۔ اس کی دیکھ بھال اور دورِ جدید کے ہم مذاق بنانے میں کوتاہی نہیں کی جاتی۔ اعلیٰ درجے کے ہوٹل، گرجے، سرکاری دفاتر خوشنما کاروباری اور نجی مکانات، زیر زمین گزرگاہیں بنا دی گئی ہیں (اور یہ بہت بھری رہتی

ہیں آج اُس حالت کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے جس حالت میں سرکاری فوجوں نے، جو نومبر ۱۹۳۶ء سے فرینکو کے مقابلے میں شہر کی حفاظت ڈٹ کے کرتی رہیں، ۱ سے مارچ ۱۹۳۹ء میں فرینکو کی فوجوں کے حوالے کیا تھا۔ ہر طرف تباہی پھیلی ہوئی تھی۔ شارع کبیر (Gran Via) پر بڑی بڑی نہایت آراستہ دکانیں باب الشمس کے بیضوی بازار میں واقع ہیں جو کبھی شہر کی آمد و رفت کا منبع تھا۔ چوڑی سڑک کے کنارے سایہ دار خیابان تھے۔ اس شارع پر جگہ جگہ بم پھٹے تھے۔ پھولوں کے بہت سے بستان و چمن خس و خاشاک رہ گئے تھے۔ جامعہ میڈرڈ کے احاطے سے دفاع کا کام لیا گیا تھا، لہٰذا گولہ باری سے اس کی اینٹ سے اینٹ بج گئی تھی۔ اب وہی احاطہ نئی نئی دلکش عمارتوں سے پھر دیکھنے دکھانے کے لائق ہو گیا ہے، نہ صرف جامعہ از سرِ نو بنائی گئی ہے بلکہ شہر بھر میں جس قدر اور جہاں کہیں ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی، وہ سب درست کر لی گئی ہے۔

پر تکلف جدید عمارتیں فضا کو گھیرتی چلی جاتی ہیں۔ بعض ۲۵ منزل بلند اور یورپ کے معیار سے فلک بوس ہیں۔ زردی مائل میدانوں میں سکونت کے لیے محلّے پر محلّے آگے پھیلتے جاتے ہیں۔ دیہات اور کھیتوں سے نئے آنے والوں کے لشکر شہر میں آرہے ہیں ان کے لیے کم قیمت مکانوں کے بہت سے منصوبے تیار کیے گئے ہیں۔ نئی تعمیر روز افزوں آبادی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ لہٰذا اکثر نو وارد شہر کے پرانے، شکستہ اور گندے محلوں میں آ بھرے ہیں اور یا بیرونی محلوں کے تنگ و نا خوشگوار حجروں میں ایک پر ایک گٹھریاں بنے پڑے رہتے ہیں مگر عام طور پر بیرونی سیاحوں کو فلاکت کے یہ مناظر دیکھنے کی بالکل نوبت نہیں آتی۔ انھیں تو میڈرڈ نہایت بارونق، نشاط انگیز شہر معلوم ہوتا ہے۔ پراڈو کے متحف میں تصاویر کا ذخیرہ پیرس کے شہرۂ آفاق لوآر کے خزائن سے کچھ کم نہیں ہے۔ پیادہ یا سواری میں سیر کرنے کے لیے سبزہ زار رتیرو نہایت دلفریب

مقام ہے، جس میں وسیع اور ہرے بھرے گھانس کے تختے، سایہ دار روشیں، پگ ڈنڈیاں، فوارے، بڑے بڑے حوض اور باغوں کے اندر نفیس طعام خانے بنے ہیں جہاں آپ کھانا کھاتے اور صاف موسم میں زیر سما ناچ کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ محاصرے کے دوران میں سردی سے ٹھٹرتے ہوئے شہری اس سبزہ زار کے درختوں پر اتنا ناز رکھتے ہیں کہ انھوں نے آگ جلانے کے لیے انھیں نہیں کاٹا۔وہ اگرچہ کہتے ہیں یہاں کے باغِ حیوانات کے کئی جانوروں کو کھا گئے۔ لیکن یہ افواہی باتیں ہیں اور بہر حال اب تو یہ باغ جانوروں سے خوب آباد ہے۔

شاہی محل سیر کرنے کے لائق ہے کہ یہاں نہایت بیش بہا مشجّر ہیں اور وہ پُرشکوہ زینہ بنا ہوا ہے جسے دیکھ کر نپولین بھی عش عش کرنے لگا تھا۔ اسی طرح شاہی ایوان اور کمرے دیکھنے کے لائق ہیں۔ مثلاً شاہی تخت گاہ اور اس میں لہریئے کے بلّوری فانوس۔ ایوان "گیس پرِیلینی" جس کی چھت سے نیلی ریشم کے پردے لٹکائے اور اس میں چینی کے پھول پھل، نیز نیم قامت چینی حکام کے مجسمے کونوں پر لگائے ہیں، یہ آرائش آدمی کو مسحور کردیتی ہے۔ ایک مشجّر کے پردوں کا کمرہ، نقش و نگار میں جواہر خانہ معلوم ہوتا ہے۔ پردوں کے بہت سے نقوش گویا کے بنائے ہوئے ہیں۔ اسی کمرے کی چھت میں آپ وہ شگاف دیکھیں گے جو خانہ جنگی میں گولہ پھٹنے سے پڑگیا تھا اور اس سلسلے میں آپ کا رہبر (یا گائڈ) بتائے گا کہ نپولین کی فوج نے اس کارخانے کو تباہ کردیا جس میں اس ایوان کی نفیس چینی تیار ہوئی تھی۔ شاہی اسلحہ خانے کی اشیاء اس طرح سجائی گئی ہیں کہ تاریخ سپین کی کتاب کے لیے سلسلۂ تصاویر بن گئی ہیں۔ یہیں غوطی بادشاہوں کے مرصّع طلائی تاج کے ساتھ پلے یو کی وہ تلوار رکھی ہے جو اس نے کوواد ونگا کے معرکے میں چلائی تھی، غرناطہ شہر کی کنجیاں جو آخری مور بادشاہ نے فردیناند اور ازابلا کے حوالے کیں اور وہ جھنڈے محفوظ ہیں جو آسٹریہ کا ڈون جوآن جنگ

لپانتو سے وطن لے کر آیا تھا۔ پست قامت پتلوں نے سر پر کلغی دار خود اور بدن میں زرہ جوشن پہن رکھے اور سپین کے نامور بہادروں کے اصلی ہتھیار لگائے کھڑے ہیں۔ چارلس پنجم کے زرہ جوشن دکھائے جاتے ہیں جن میں سے بعض میں سونا جڑا اور بہت نفیس کندہ کاری کی گئی ہے۔ شہزادہ کارلوس کی زرہ اور ڈون جوآن کے ہتھیار، نیز جوآن دِ پڈلا کے اسلحہ رکھے ہیں جسے چارلس پنجم نے "غیر ملکیوں" کے خلاف طلیطلہ میں بغاوت کرانے کی بنا پر موت کی سزا دی تھی۔ کارلوس وہ نوعمر شہزادہ ہے جس کی شبیہیں یاد ہوگا کہ ولاس کوئز نے تیار کی تھیں۔

میڈرڈ کی آب و ہوا کی تعریف وہاں کے محبانِ وطن بھی نہیں کرتے۔ اگرچہ انھیں اس کی اونچی اور خشک ہوا کے صحت بخش ہونے پر اصرار ہے۔ اور کچھ شک نہیں کہ سطح مرتفع پر بھی دو ہزار فٹ بلندی پر واقع ہونے کے باعث میڈرڈ یورپ کے تمام پائے تختوں سے بھی بلند ہے۔ اسے شدید گرمی اور بلا کی سردی سے سابقہ پڑتا ہے۔ درجۂ حرارت میں یکایک تبدیلی ہوجاتی ہے۔ شمالی پہاڑوں کی تیز و تند ہوائیں مصیبت بن جاتی ہیں۔ گرمی میں سرکاری دفاتر شمالی ساحلِ بحر کے شہر سباستین میں منتقل ہوجاتے ہیں اور بیرونی سفیر بھی وہیں چلے آتے ہیں۔ کسی "معزز شریف" سے توقع نہیں کی جاتی کہ شہر میں رہے گا اور جن لوگوں کو ٹھیرنا پڑتا ہے، مشہور ہے کہ وہ دوستوں کی صحبت اور مقررہ نشست گاہوں میں جانا چھوڑ دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ لوگ انھیں ایسا غیر وضع دار خیال کریں جو گرمیوں میں بھی شہر چھوڑ کر باہر نہیں گیا۔

بہرحال گرمی ہو یا سردی عام میڈرڈ والا اسی بے پروائی سے موسم کی برداشت کرتا ہے جو اہلِ ہسپانیہ کی خصوصیت ہے۔ چند بالکل جدید اور بڑی لاگت کے مکانوں کو چھوڑ کر بہت کم ایسے مکان یا سکونت کے کمرے ملیں گے جنھیں ہم ولایاتِ متحدہ کے لوگ جاڑوں میں کافی گرم خیال کریں۔ رتیرو کے تالاب سردی کی شدت سے ایسے جم جاتے ہیں کہ ان پر

بخوبی سکیٹنگ (=یعنی پہیہ دار کھڑاؤں) سے دوڑ کی جا سکتی ہے لیکن اس زمہریری موسم میں بھی "ایسا کمرہ جس میں دھوپ آتی ہے کافی گرم سمجھا جاتا ہے اور کوئلے کی انگیٹھی یا چھوٹا برقی چولھا سرد راتوں میں آپ کے پاؤں کے قریب دہک رہا ہو تو یہ پورے آرام و راحت کا سامان تصور کیا جاتا ہے۔

میڈرڈ والے (میڈری لینو) کی ایک اور صفت یہ ہے کہ دن رات میں کچھ زیادہ فرق نہیں سمجھتا۔ اکثر باشندے رات کو بہت کم سوتے ہیں۔ ہاں دوپہر بعد دیر تک قیلولہ کرتے اور تھوڑی نیند لے لیتے ہیں۔ اس وقت تمام دفاتر اور اجناس کی دکانیں بند رہتی ہیں۔ ساڑھے چار یا پانچ بجے سہ پہر کو اہل شہر دوبارہ بیدار ہوتے ہیں اور پھر کاروبار ہونے لگتا ہے اور گھنٹوں تک خوب چہل پہل رہتی ہے۔ قریب ۶، ۶½ بجے شام تفریح کا وقت شروع ہوتا ہے۔ آپ گاڑی لے کر رتیرو کی ٹھنڈی تازہ ہوا کھانے نکل جائیں تو بہت سے خوش لباس لوگوں کو اسی طرح سیر کرتے دیکھیں گے۔ چاہیں تو سینما یا "زرزویلہ" کے سانگ دیکھنے چلے جائیں جہاں شام کا تماشا ۶½ بجے سے شروع ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر نو بجے کے قریب آپ باہر نکلیں گے تو کوچہ و بازار میں گہما گہمی اور کھانے کے وقت میں ابھی دیر ہوگی۔ اتنے سویرے سوائے بدیسیوں کے وہاں کوئی کھانا نہیں کھاتا۔ دس بجے تک ٹھیریئے۔ البتہ اگر ۱۱ بجے رات والے تھیٹر میں جانا ہے تو پہلے کھا لیجیئے ورنہ کھانا اطمینان سے کھاتے رہیئے پھر آدھی رات کے قریب بازاروں کا گشت لگایئے جو روشنی سے جگمگاتے ہوں گے۔ گپ شپ، قہقہے، گیتوں کی آوازیں گونجتی ہوں گی۔ پہلوؤں کی پٹڑیوں پر لوگوں کی بھیڑ لگی ہوگی۔ بعضوں کے بچے انگلی پکڑے ان کے ساتھ ہوں گے۔ برف کے مشروبات والے خونچے لیے پھرتے ہوں گے۔ بوڑھی عورتیں اور لڑکے لاٹری کے ٹکٹ بیچتے اور بار بار آپ کو سناتے ہوں گے کہ چند آنے ہیں اگر پہلا نمبر آپ کا نکل آیا تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ کرسمس کی لاٹری

کا پہلا انعام دو کروڑ پسیتہ یعنی تقریباً ۵ لاکھ ڈالر ہوا کرتا ہے۔ ہر عمر اور ہر مرض کے بھکاریوں کی بھی کمی نہ ہوگی جو آپ سے خیرات مانگیں گے۔

سرِ راہ یا بند دروازوں کے اندر چائے خانوں میں بھی اس وقت خوب رونق ہوتی ہے۔ میزوں کے گرد ٹولیاں بیٹھی، کھانے پینے، گپ شپ، ہاتھ ہلا ہلا کر بحث و مباحثہ کرنے میں مصروف ہوتی ہیں۔ اندر کے کمروں میں تمباکو کا دھواں بھرا ہوتا ہے اور تھوڑی دیر میں اس کے دَل بادل یا بے خوابی کے باعث آپ کا سر چکرانے لگتا ہے۔ اسی دَل بادل میں آپ نظر دوڑا سکتے ہیں تو دیکھیں گے کہ عورتیں جا چکیں، اب دیوان میں صرف مرد ہی مرد رہ گئے ہیں۔ آخر لوگ میزوں سے اُٹھ کر موج در موج بازاروں میں پھیلیں گے تو ان میں اس وقت بھی دھوم مچی ہوگی۔ شبینہ کلب اور تھیٹروں سے شوقینوں کی ٹکڑیاں پلٹ رہی ہوں گی۔ غرض رات کے ڈھائی تین بجے تک آپ کی ہوٹل میں واپسی ہوگی۔ اگر کسی کمرے یا اقامت خانے میں آپ ٹھیرے ہوئے ہیں تو اس عمارت کے دروازے پر پہنچ کر زور زور سے تالی بجائیے اور جب تک رات کا چوکیدار سن کر آواز دے اور ایک طرف سے لڑکھڑاتا ہوا آئے، کھڑے جمائیاں لیتے رہیئے کیونکہ بیرونی دروازے کی کنجی اسی کے پاس ہوتی ہے۔ وہ آپ کو کنجی دے گا۔ شب بخیر کہہ کر رخصت ہوگا (حالانکہ اب صبح بخیر کہنے کا وقت ہوگا)، تو اس وقت آپ سوچتے ہوں گے کہ سپین کے بڑے شہروں میں بسر کرنے کے اصلی کمرے تو چائے خانے اور بازار ہیں۔ پھر آپ کی سمجھ میں آئے گا کہ آپ کے ہسپانوی شناسا جو آپ کو ہمیشہ طعام گاہ، چائے خانے یا کسی تھیٹر میں لے جاتے ہیں اور کبھی اپنے گھر نہیں بلاتے، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ خود جہاں سب سے زیادہ لطف اُٹھاتے ہیں، دراصل انھی مقامات پر آپ کی مدارات کرنا چاہتے ہیں۔ صبح ہوتے گرم دودھ میں حل کیے ہوئے تھوڑے دیا گاڑھے چاکلیٹ یا چائے اکرارے توس یا "رولز" کا ناشتہ کرنے کے بعد آپ محسوس

کریں گے کہ خریداری کے لیے بازاروں میں گھومنا بھی کیسی مشقت کا کام ہے۔ میڈرڈ
کی اکثر تعریف کی جاتی ہے کہ خریداروں کی جنت بھی شہر ہے۔ بے شبہ اہل اسپین بڑے
اچھے کاریگر ہیں اور میڈرڈ کی دکانوں میں ایسی ایسی چیزیں بکتی ہیں کہ بہت جلد آدمی کی
جیب خالی ہوجاتی ہے۔ مثلاً یہاں کے دستانے اور بڑے بٹوے پیرس کو بھلا دیتے ہیں۔ سلمہ
ستارے کے کام کی نفیس ململیں فرانس واطالیہ سے کم خوبصورت نہیں ہوتیں، سفالی ظروف
نہایت خوشنما اور اسی طرح پنکھیاں، کنگھے، زرّیں جالی بہت اچھی ملتی ہیں۔ کارچوب کے بڑے
پارچوں کے علاوہ لیس کے وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی ملتے ہیں جنھیں برہنہ سر ہسپانوی عورتیں
اپنے بٹوے میں رکھتی ہیں کہ گرجا کی نمازِ جماعت میں شریک ہوں یا ذرا کی ذرا شمع روشن
کرنے اور دعا مانگنے اندر جائیں تو انھیں اپنے بالوں پر جمالیں۔

"پیورتا دل سول" کے عقب میں میڈرڈ کا مشہور راسترو واقع ہے۔ اس لفظ کے معنی
گھڑی سمجھیے۔ چنانچہ اس بازار میں کنارے کی پٹڑیوں پر الماریوں میں، کھوکھوں میں آپ کو
دنیا بھر کی چیزوں کے انبار نظر آئیں گے: قیمتی سے قیمتی اور گھٹیا سے گھٹیا۔ پرانا ریشم، تانبے
کے برتن، بغیر برج کے پیالیاں اور بے پیالیوں کے برجیں۔ اسی میں کہیں وینس کے شیشے
کی کوئی نفیس صراحی، زری کا کام، کہ میلا تو ہوگا مگر ہنرمندی کا نمونہ ہے۔ بازار کی چھوٹی
دکانوں میں بہتر قسم کا چیدہ سامان جمع ہوتا ہے۔ ممکن ہے کسی جگہ آپ کو کوئی پرانی
کتاب جس کی تلاش تھی اور اب چھپنی موقوف ہوگئی ہے، ہاتھ آجائے۔ ڈرسڈن کے ساختہ
چائے کے برتنوں کا پورا جوڑ مل جائے یا کوئی نادر قلمی تصویر۔

راستوں کی بھیڑ میں دھکا پیل کرنے اور دھکے کھانے سے آپ ضرور تھک جائیں گے
اور کسی سرِراہ چائے خانے میں سستانے، قہوہ، لمونید یا برف پینے بیٹھ جائیں گے۔ اس
حال میں آتے جاتے لوگوں کی روزمرہ زندگی کی خوشی یا ملال کی کیفیت دیکھیں گے اور
بعض چہرے ایسے ہوں گے جیسے کوئی کردار جسے فوراً افسانے میں لانے کی ضرورت ہے۔

جنرل فرانکو کی فوج رکاب کے مُور سپاہی سفید لبادے پہنے، عمامے باندھے، شہری فوج کے جوان چمکتے چمڑے کی سہ گوشہ ٹوپیاں پہنے جیسی ناٹک میں پہنی جاتی ہیں۔ اسی طرح بھاری بھرکم فوجی سردار، خاکی قمیص، اچھے بُرے ہیٹ پر سُرخ یا چمکتے ہوئے نیلے پٹکے باندھے گزرتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی انّا یا دایہ اپنے دیہات کی خاص وضع کے بھڑکیلے کپڑے پہنے کئی کئی قبول صورت بچوں کو لیے سامنے سے نکل جاتی ہے۔ عورتیں اور لڑکیاں جنھیں آپ دیکھیں گے سبھی خوبصورت اور شکیل نہ ہوں، ان میں بھی ایک آن اور کشش ضرور پائی جائے گی۔ ہسپانوی عورت کیسی ہی غریب ہو اور فلاکت زدہ گھر سے نکل کر آئے، بناؤ کیے بغیر سامنے نہ آئے گی۔ اسے اپنی صورت پر ناز ہے اور آمدنی کا آخری آنہ تک سنگار پر خرچ کیے بغیر نہیں رہتی۔

آپ کے سامنے سے کوئی جنازہ گزرے تو اس کے تابوت لے جانے میں بھی آپ کو بڑا اہتمام نظر آئے گا۔ بچوں کا سفید اور بڑوں کا تابوت سیاہ ہوتا ہے۔ یعنی رتھ کے گھوڑے بھی کلغی دار ہوں گے اور مرنے والا جتنا زیادہ معزز ہو اسی قدر گھوڑے زیادہ اور ساز و یراق میں تکلف پایا جائے گا۔ موت بھی سپین میں ایک قسم کا سوگوار تہوار بن جاتی ہے اور ہر خاندان اسے حتی الامکان شاندار بنانے میں زیادہ سے زیادہ خرچ برداشت کرتا ہے۔ سپین کے قبرستانوں میں جدھر دیکھیے خوبصورت پتھر کے تعویذوں اور مجسموں کے جھنڈ نظر آئیں گے۔

میڈرڈ کو صدر مقام بنا کر آپ قستالیہ کے پیلے، بے گیاہ میدانوں میں آس پاس گشت لگا سکتے ہیں۔ برف پوش گوادرمہ پہاڑ کے نچلے پہلوؤں پر قصر اسکوریال کی عمارتیں میڈرڈ سے ۳۱ میل شمال مغرب میں سر اُبھارے کھڑی ہیں۔ اسی قدر فاصلے پر شمال مشرق میں "انقلادِ نہارس" واقع ہے جس کا دارالعلوم سلامانکا سے اپنے عروج کے زمانے میں مقابلہ کرتا تھا۔ ۱۸۳۶ء میں اسے طلبہ سمیت دارالحکومت میں منتقل کر لیا گیا اور اب وہ

میڈرڈ یونیورسٹی کہلاتا ہے۔ تاہم القلا کے دار العلوم کی عمارات، اس پرانی بستی میں ابھی تک گزشتہ عظمت کی یادگار باقی ہیں۔ آپ ان میں سے کسی ایک کے سنگ بستہ صحن سے گزر کر کھانا کھانے کے کمرے کے اندر آئیں تو وہ آج بھی ویسا ہی دکھائی دیتا ہے جیسا صدیوں سے رہا جب اُستاد اور طالب علم سب ایک اونچے وسیع آتش دان کے گرد ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد آپ وہ مکان دیکھئے کہ جہاں سروانتس پیدا ہوا تھا۔

میڈرڈ سے صرف نومیل پرےابی پاردو کا محل بھی دیکھنے کے لائق جگہ ہے۔ اس کے ہر طرف اونچی نیچی زمین میں سوکھے ہوئے بلوط کے درخت کھڑے ہیں۔ پہلے یہ جگہ شاہی شکارگاہ تھی۔ خانہ جنگی میں قصبہ ال پاردو برباد ہو گیا تھا لیکن اب دوبارہ خوش نما طرز پر تعمیر کر لیا گیا ہے اور اسی میں ایک مسجد بھی ہے۔ جہاں جنرل فرانکو کی فوج رکاب کے مُور سپاہی نماز پڑھتے ہیں۔

قشتالیہ کے گرد آلود سخت و مفلس دیہاتی نواح میں، جہاں کوئی پہاڑی بستی یا گڑھیا سراب کی طرح نمودار ہو جاتی ہے، آپ کو احساس ہوگا کہ جس طرح یہ خطہ شور و شغب سے خالی ایک خاص شان رکھتا ہے قریب قریب یہی وصف اس زمین کے رہنے والوں میں نمایاں ہے۔ اہل قشتالیہ میں اپنے جنوبی ہمسایوں کی سی مہر و محبت نہیں اور نہ شمال و مشرق کے ہم وطنوں جیسی افراط و ثروت ہے لیکن اپنی جنم بھومی کی طرح ان دُبلے پتلے سنجیدہ اور ہٹیلے لوگوں میں حوصلہ مندی اور بلند خیالی کی کمی نہیں۔ یہ اوصاف میدانِ عمل کو وسعت بخشتے ہیں اور جزیرہ نما کی کسی قوم نے اتنے اعلیٰ قصر اور قلعے تعمیر نہیں کیے جیسے قشتالیہ والوں نے بنا دیے ہیں۔

باب سیزدہم

اندلسیہ

قشتالیہ سے جنوب کی ولایت اندلسیہ کو کوہستانِ سیاہ (Sirra Morena) سے گزر کر چند ہی راستے گئے ہیں جس سے گمان ہوتا ہے کہ فطرت سپین کے اس نشاط انگیز قطعے کو شمال کی گرم و ناگوار ہواؤں تک سے بچانا چاہتی تھی۔ کوہستانِ سیاہ کے مہکتے پھولوں کی پہاڑیوں اور تنگ کوہستانی وادیوں کے راستوں سے آپ قشتالیہ سے اندلسیہ کا سفر کریں گے تو اپنے آپ کو اس خطہ میں پائیں گے جسے اکثر اہلِ نظر "خصوصی سپین" کہتے ہیں۔ بہت سے پہلے سیاحوں کی طرح آپ کا بھی جی چاہے گا کہ آپ شاعر، یا نقاش یا رقاص ہوتے اور اس طلسماتی علاقے میں جو کیفیات آپ کے دل میں ابھر رہی ہیں ان کا اظہار کر سکتے۔

اندلسیہ کے معنی ہیں گرد آلود سڑکیں جو یوکلپٹس کے درختوں اور ناگ پھنی کے جنگلوں کے درمیان بل کھاتی گزرتی ہیں۔ جلی ہوئی گھانس کے مٹیالے، بھورے، ہرے میدانوں میں سفید بستیاں دھوپ میں چاندی کی طرح چمکتے ہوئے زیتوں کے جھنڈ، سنترے کے باغ کہ گرم ہوا میں ان کی مٹھاس برداشت کرنا دشوار ہے۔ تابناک آسمان کے بالمقابل بے گیاہ پہاڑیاں اور برف پوش چوٹیاں — انھی دور کی پہاڑیوں پر موروں کی قدیم بستیوں کے مینار سر اُٹھائے کھڑے ہیں۔ سڑکوں کو جا بہ جا گدھوں کی قطاریں روک رہی ہیں، جن کے پالان ایندھن، گھانس اور پھل پھلاری سے پھٹے پڑتے ہیں۔ اندلسیہ بڑی بڑی جاگیر داریوں کا اور ان میں محنت کرنے والے، بھوکے غریب لوگوں کا علاقہ ہے۔ دُبلے پتلے بچے گاؤں کی گلیوں میں آپ کے پیچھے پیچھے دوڑتے اور آنہ دو آنہ کی بھیک مانگتے ہیں۔ اتوار یا تیر تہوار کے دن عورتیں بڑی شان سے

اونچے کنگھوں پر سلمے ستارے کی سیاہ خمار ڈال کر نکلتی ہیں۔ میلوں، تہواروں، زیارتوں اور اسی طرح جبیبوں اور لڑائی کے اچھے سے اچھے سانڈوں کی یہاں کثرت ہے۔

اندلسیہ میں سر بازار کسی لڑکی سے جسے آدمی چاہتا ہے، کلماتِ تحسین کہنا معیوب نہیں ہے۔ شریف زادیاں بغیر کسی کو ساتھ لیے گھروں سے نہیں نکلتیں۔ کوئی امریکی عورت بھی اگر ہمراہی نہ ہوں تو اپنے آپ کو یہاں تھے بازاروں میں نمایاں نہیں محسوس کرتی۔ یہاں کے ہر شہر میں جداگانہ دل کشی کے سامان ہیں۔ قرطبہ میں مسجد جامع، موروں کے قدیم پل اور پرانے حصے میں پیچ دار گلی کوچے۔ ملاغہ اور قادس میں خوشگوار ہوا اور کنارِ بحر اعلیٰ درجے کے مکانات ہیں۔ ان میں سے پہلا تو بحر روم کے ساحل پر ہے اور دوسرا نیلے اوقیانوس کے کنارے، اپنی سفید عمارات کے بازاروں کو اس طرح بڑھاتا ہے جیسے لمبی لمبی چمکتی ہوئی انگلیاں۔

رہا شہر رونده، تو یہ اپنی اونچی اونچی پھیلی پھیلی پہاڑیوں پر بہت بلند واقع اور گوادل وین ندی کی چوڑی، خوف انگیز، سیندوری رنگ کی وادی سے دو حصوں میں کٹ گیا ہے۔ اس نمونے کا شہر آپ نے کہیں نہ دیکھا ہوگا۔ ندی پر تین پل بنے ہیں۔ ایک سب سے نیچا اور پرانا اہلِ روم نے بنایا تھا۔ دوسرا موروں نے، اور تیسرا جو نیا پل کہلاتا ہے، ڈیڑھ سو سال یا کچھ پہلے کا بنا ہوا ہے۔ ندی کے سلامی دار کناروں پر بھی سفید سفید مکان نیچے کی بہتی دھار تک اس طرح بل کھاتے چلے گئے ہیں کہ دیکھنے والا چکرا جائے۔ شہر کا پرانا حصہ بھی اُلجھی ہوئی ذلیل گلیوں کا تانا بانا بناتا، اوپر نیچے ہوتا، اوپر اُٹھا چلا گیا ہے۔ ان گلی کوچوں میں گندے بچوں کا ہجوم بھیک مانگنے کے لیے جمع ہو جاتا ہے اور سنولائے رنگ کے مرد و عورت مشتبہ نگاہوں سے گھورتے اور آپ کو یہ واقعہ یاد دلاتے ہیں کہ رونده صدیوں سے محصول چوروں کا ملجا اور مرجع رہا ہے۔ انھی فلاکت زدہ پرانی گلیوں میں بعض بہت اچھی حویلیاں ہیں جن کے پائیں باغ کا سلسلہ کم ہوتا ہوا گھاٹی کی تلہٹی تک جاتا ہے۔ رونده میں سانڈوں کا دنگل غالباً ملک بھر میں سب سے خوش منظر

ہے، جس کی چوبی نشستوں پر سائبان اور سامنے لوہے کی جالی لگی ہے۔ ایک ملنس مکھ بڑھیا آپ کو یہاں کی سیر کرائے گی اور شاید یہ بھی سُنائے گی کہ رَونده کے شہرۂ آفاق گاوَزن پیڈرو رومیرو نے ڈیڑھ سو برس پہلے اس کھیل کے قاعدے بنائے تھے جو اب تک رائج ہیں۔ وہ مصوّر گویا کا ہم عصر تھا اور خیال کیا جاتا ہے کہ گاوَزنوں کے چمکیلے لباس کی، جو ابھی تک وہ پہنتے ہیں، یہ وضع تجویز کرنے میں گویا کا بھی دخل تھا۔

غرناطہ اور اس کے الحَمرا یا قصر سرخ کا کچھ حال آپ سن چکے ہیں۔ جسے موروں نے ایسے دلفریب مقام پر تعمیر کیا ہے کہ اس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ یعنی رودِ دَرو کے کنارے بلند پہاڑی پر جس کے سامنے دور تک سرسبز میدان پھیلا ہوا ہے اور سرے پر کوہِ نِوادا کی برف پوش چوٹیاں بلند ہیں۔ چارلس پنجم نے اس مقام پر محل بنانے کے لیے الحمرا کا ایک حصہ تڑوا دیا پھر بھی عظیم الجثہ فصیلیں موروں کی بنائی ہوئی ہنوز اسی طرح کھڑی ہیں۔ بہت سے دل کشا صحن و چمن، نازک تراش کی محرابیں بیش قیمت چوکوں کی چھتیں اور حسین ترین منظر والے حجرے سلامت ہیں۔ غرناطہ کی ایک اور پہاڑی پر مور بادشاہوں کا گرمائی محل "جَن رَلیف" بنا ہوا ہے اور اس کے فرحت بخش باغ اور مناظر موجود ہیں۔ فردیناند اور ازابلا اس شہر کو موروں سے فتح کرنے کے باعث یقیناً بڑی خصوصیت دیتے تھے کہ اسی کے بڑے کلیسا کے عبادت خانے میں اُنھوں نے اپنی قبریں بنوانا پسند کیا۔ اُن کے ہیبس برگ جانشین قصر الحمرا کے بڑے قدرشناس تھے اور گو ہمیشہ تنگ دست رہے، اس کی نگہداشت میں انھوں نے کمی نہیں کی مگر بوربون بادشاہوں نے اس کی طرف سے ایسا تغافل کیا کہ وہ نیم ویران اور چور اُچکّوں کا ٹھکانا بن گیا۔ نپولین نے اس میں اپنی فوج ٹھیرادی تھی کیونکہ وہ مضبوط قلعے کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس کے فرانسیسی سپاہی جب یہاں سے رخصت ہوئے تو الحمرا کے چند برجوں کو انھوں نے اُڑا دیا۔ ۱۸۲۹ء تک اس کی حالت بہت خراب ہوگئی

تھی جب کہ امریکی مصنف واشنگٹن اِرونگ اس کی افسانوی عظمت و شان دیکھ کر دلدادہ ہوگیا اور ایک سکونتی کمرے میں مقیم ہوکر اس کے متعلق کہانیوں اور خاکوں کا ایک سلسلہ "قصص الحمرا" کے نام سے تصنیف کیا۔ اس کتاب نے امریکی اور انگریز سیاحوں کو ایسا گرویدہ کیا کہ جوق در جوق غرناطہ آنے لگے۔ تب اہلِ سپین کی بھی سمجھ میں آیا کہ اگر الحمرا کی دیکھ بھال نہیں کی گئی تو وہ بالکل برباد ہو جائے گا۔ وہ آج تک ارونگ کا احسان مانتے ہیں کہ زیادہ تر اسی کی وجہ سے وہ اپنے وطن کا یہ بیش بہا خزانہ محفوظ کرنے پر آمادہ ہوئے۔ سیاحوں کی آمد کی بدولت غرناطہ مالا مال اور جدید شہر بن گیا۔ الحمرا اور گرمائی محل کے صحن و چمن میں اب ہمہ وقت زائرین کا ایسا ہجوم رہتا ہے کہ جب تک آپ ہجوم سے بچ کر دور کے پہاڑوں یا زیر نظر بہت نشیب کے درختوں پر نگاہ نہ جمائیں وہ لطیف احساس اور قلبی کیفیات پیدا نہ ہوں گی جو اس شہ کار حسن و جمال کو دیکھ کر پیدا ہونی چاہئیں۔

اشبیلیہ ولایاتِ اندلسیہ کا دارالحکومت اور سپین کے سب سے بڑے شہروں میں سے ایک ہے، پھر بھی حسن و قدامت کے اعتبار سے تصویری کتاب کا شہر معلوم ہوتا ہے۔ یہ دریائے وادی الکبیر کے مسطح کنارے پر آباد ہے۔ ایک زمانے میں غرب الہند (امریکا) کی ساری تجارت اسی کی بندرگاہ سے گزرتی تھی۔ فرانس، اطالیہ، پرتگال کے جہاز دریا کے راستے آتے اور اشبیلیہ کی جہازی گودیوں میں ٹھیرے رہتے تھے۔ لیکن اب یہ صرف جزائر کینیری اور سپین کے درمیان آمد و رفت کی بندرگاہ رہ گیا ہے۔

اشبیلیہ کے صحن خانے مشہور ہیں۔ یہ گویا کھلی جگہ میں رہنے کے کمرے ہیں۔ گلی کوچوں میں لوہے کی جالی کے دروازوں کی قطاریں بنی ہیں۔ اندر جھانک کر دیکھیے تو بڑے پرکشش صحن نظر آئیں گے کہ بعض کے فرش گلابی مرمر کے اور سامنے کی دیواریں نیلے چوکوں سے بنائی ہیں۔ وسط میں حوض اور گرد گلاب و یاسمین وغیرہ پھولوں

کے بڑے بڑے گملے رکھے ہیں۔ کوچہ و بازار اتنے تنگ ہیں کہ کوئی سواری گزرے تو آپ کو کسی مکان کی دیوار سے چپک کر کھڑا ہونا پڑے گا کہ موٹر گزر جائے۔ حد یہ کہ یہاں کی بڑی شارع جسے Calle Sierpes (سانپوں کا بازار) کہتے ہیں، تنگ ہونے کی وجہ سے اس میں کسی سواری لے جانے کی اجازت نہیں۔ عموماً اسی بازار میں اہل شہر خرید و فروخت کرنے، شربت یا قہوہ پینے اور گپ شپ کرنے کے لیے دن یا رات کو جمع ہوتے ہیں۔ ہر طرح کی چیز بکتی ہے، پنکھا، کنگھا، کتابیں، پھول، تیلیوں کے پنجروں میں پرندے، ایک دو بجے رات تک آپ یہاں اُلوؤں کی بولیاں سنتے رہیے۔ دن کو کرمچ کے پردے بادبانوں کی طرح اوپر سارے بازار پر پھیلا دیئے جاتے ہیں کہ تیز دھوپ سے بچاؤ رہے۔ شام کو انھیں لپیٹ دیا جاتا ہے اور صاف آسمان کے نیچے بیٹھتے یا چلتے پھرتے ہیں۔ یہاں آپ کو ابھی تک یہ ضرور یاد آئے گا کہ اشبیلیہ مسلمانوں کا شہر رہا ہے۔ جیرالدہ کا بلند مینار ہی موروں کی قدیم مسجد کا ماذنہ ہے۔ مسجد کو کلیسا بنا لیا گیا تو اس سے گھنٹا بجانے کے مینار کا کام لینے لگے۔ شاہی خاندان کا محل بھی اصل میں موروں کا بنایا ہوا قصر تھا جس میں کچھ ردّ و بدل کر لی گئی۔ اس کے گلاب کے چمن، سرو و صنوبر کے باغ دیکھنے کے لائق ہیں۔ حوضوں، فواروں کے گرد خوشنما روشیں بل کھاتی چلی گئی ہیں جن کے دو رویہ بکسیس درختوں کی قناتیں کھڑی ہیں جعفری دار بنگلہ موروں کا گرمائی مکان تھا جس میں کہتے ہیں چارلس پنجم گھنٹوں بیٹھ کر چائے پیتا رہتا تھا۔

جنوبی سپین کے اکثر شہروں میں ایسٹر کا تہوار دھوم دھام سے منایا جاتا ہے لیکن اشبیلیہ کا یہ میلہ سب جگہ سے بڑھا چڑھا ہوتا ہے جس کو دیکھنے کے لیے باہر کے سیاح سال سال بھر پہلے سے ہوٹل کے کمرے کرائے پر لیتے ہیں۔ ایسٹر سے قبل سہ شنبہ تا جمعہ مبارکہ (Good Friday) بازاروں میں دن رات مذہبی جماعتوں کے جلوس نکلتے رہتے ہیں۔ جن میں کوئی چالیس چالیس آدمیوں کی ٹولیاں بڑے بڑے

تختوں (Pasos) کے جلو میں گشت لگاتی ہیں۔ تختوں پر مقدس مورتیاں، اکثر حضرت مریمؑ کے مجسمے دھرے ہوتے ہیں جلوس اپنے اپنے علاقے کے گرجا سے چلتا اور سانپوں کے بازار سے ہوتا ہوا، وسط شہر میں بڑے کلیسا تک جاتا اور پھر واپس اپنے مقام پر آجاتا ہے۔ یہ بڑے تخت اتنے وزنی ہوتے ہیں کہ بعض اوقات ان کے نیچے سو سو آدمی چھپے ہوئے انھیں اُٹھا کرلے چلتے ہیں۔ ساتھ والے زرق برق، رنگ برنگ کے لباس پہنے ہوتے ہیں اور دن کی دھوپ یا رات کی روشنیوں میں رنگوں کی بڑی بہار دیکھنے میں آتی ہے۔ ان کے لباس میں لمبے لمبے لبادے اور چغے ہوتے ہیں، اور اوپر چونچ نکلی ہوئی خمار جسے چہرے پر نقاب کے طور پر ڈال سکتے ہیں۔ ان میں اصلی دلکشی عجیب عجیب رنگوں کے مل جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک جماعت کی خمار ارغوانی اور نیچے قرمزی لبادہ ہے تو دوسری کے کاہی لبادے پر زربفت کی خمار ہے۔ ایک اور ٹکڑی سیاہ لبادہ اور سبز خمار میں نکل رہی ہے۔ قدیم مورتیوں کے گرد جو تخت پر بٹھا کر نکالی جاتی ہیں، ماننے والوں کا اژدہام ہوتا ہے۔ مگر ان مورتیوں میں سب سے زیادہ مقبول عوام غالباً مراد دینے والی عذرا، کی مورتی ہے جسے la Maoarena کہتے ہیں کیونکہ وہ جپسیوں کی بیرون شہر تریانہ کے محلے "مکاریناؔ" کے گرجا میں رہتی ہے۔ یہ مورتی غریبوں اور گاؤزنوں کی پیاری ہے۔ دنگل میں اترتے وقت گاؤزن اسی سے مدد چاہتے ہیں اور کامیاب ہونے پر اس کی نذر نیاز دیتے ہیں۔ ایک مشہور جپسی نوجوان گاؤزن جوس لیتو ہر سال اس مورتی کو بیش قیمت چھلا چڑھایا کرتا تھا تا آنکہ سانڈوں کے دنگل میں ایک بار ہلاک ہوگیا۔

ان خمار پوش جلوسیوں میں اور تخت اُٹھا کر چلنے والوں میں ممکن ہے بعض انارکسٹ بھی شامل ہوں اور انھوں نے خانہ جنگی میں شاید گرجوں کے جلانے میں بھی حصہ لیا ہو، لیکن ہر ایک اپنی خاص بی بی مریمؑ (کی مورتی) کا ضرور معتقد ہے اور اسے جلوس میں قیمتی سے قیمتی زیور و لباس پہنا کر نکالنے پر تلا ہوا ہے۔ اس غرض کے لیے تکلیف اُٹھا کے چندے

بھرتا ہے اور دوسری ٹولی والے اپنی مورتی کو بہتر بتائیں تو ان سے لڑنے کو تیار رہے، جلوس کے گشت میں نو، دس گھنٹے لگ جاتے ہیں کیونکہ تماشائیوں کے اژدہام میں وہ آہستہ آہستہ چلتا ہے اور جگہ جگہ تخت اُٹھانے والوں کو ستانے کے لیے یا راستے میں سَئتہ کا سلام لینے کے لیے ٹھیرتا ہوا جاتا ہے۔ سَئتہ کے معنی تیر ہیں۔ یہ وہ گیت ہے جو بی بی مریم کی عقیدت کے جوش میں کوئی مرد جھروکے سے یا کوئی عورت کھڑکی سے جھک کر بے اختیار گانے لگتی ہے۔ غالباً ایک دم آواز نکالنے کی وجہ سے اسے "تیر" کہنے لگے ہیں۔ جس وقت یہ بے خودی کا گیت ہوا کو چیرتا ہوا بلند ہوتا ہے تو بازار کے سب باجے، گانے اور ڈھول نقارے رک جاتے ہیں۔ مجمع پر خاموشی چھا جاتی ہے جب تک سَئتہ کا سلسلہ جس میں گانے والا اپنی طرف سے بھی کچھ ملاتا رہتا ہے، جاری رہے۔

۱۵ اگست عید مریمؑ (بی بی مریم کو خدائی میں قبول کرنے) کی تاریخ ہے اور یہ میلہ بھی اشبیلیہ میں جلوس کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ گھروں کے روکار ریشم کی جھنڈیوں، پھولوں سے سجائے جاتے ہیں۔ لوگوں کا ہر طرف اژدہام ہوتا ہے۔ جیرآلدہ کے گھنٹوں کی آواز سے کان بہرے ہوئے جاتے ہیں۔ اسی بڑے کلیسا سے صبح کو "دوشیزۂ سلاطین" کا جلوس بازاروں میں نکلتا ہے۔ یہ مورتی شہر کی سرپرست اور تمام یہاں کی مورتیوں کی ملکہ مانے جانے کے لائق ہے کیونکہ سب سے قدیم ہے اور بہت بہادری دکھا چکی ہے ـــــ اس کا قصہ یوں ہے کہ بارھویں صدی عیسوی (چھٹی ہجری) کے بادشاہ فردیناند سوم نے موروں کے مقابلے میں خدائی مدد پانے کے لیے ایک سنگ تراش کو حضرت مریم کا بت بنانے پر مقرر کیا۔ اس نے بت تراشنا شروع کیا۔ لیکن فردیناند نے جب یہ کہلا بھیجا کہ مجھے تین دن میں یہ بت لازماً مل جانا چاہیئے تو سنگ تراش بالکل مایوس ہوگیا اور اپنے کارخانے میں قفل ڈال کر چل دیا۔ تیسرے دن خود فردیناند کارخانے میں پہنچا اور اسے کھلوایا تو کیا دیکھتا ہے کہ بت تیار موجود ہے۔

اس کے بعد سے یہ مورتی بادشاہ کی تمام معرکہ آرائیوں میں اس کے ساتھ رہی۔ اسے پورا

یقین تھا کہ اشبیلیہ اور قرطبہ کو موروں سے لینے میں اس مورتی کی مدد شامل حال رہی. ایک دفعہ لڑائی میں اُس کے زخم آگیا اور افسانے میں تاکیداً بتایا جاتا ہے کہ پھر ہرچند رنگ روغن کیے گئے، زخم کا نشان کسی طرح نہیں مٹا بلکہ آج آٹھ سو برس بعد بھی جب اس کی سواری نکلتی ہے، آپ اس کے چہرے پر وہ نشان دیکھ سکتے ہیں. سواری میں سرخ اور سنہری زرہ اس کے بر میں ہوتی ہے اور یاقوت والماس کا تاج سر پر، جسے پچیس تیس برس ہوتے ہیں اشبیلیہ والوں نے بنوایا ہے کیونکہ وہ اس مورتی کے دائمی احسان مند ہیں.

اپریل کا میلہ ایک اور خوشی کی تقریب ہے. یہ زمیں واری نمائش تین دن رہتی ہے. ہر سہ پہر کو سانڈوں کی لڑائی اور رات کو صبح ہونے تک ناچ اس کی خصوصیات ہیں. اس موقع پر اشبیلیہ کے دولت مند زمیندار اپنی شہری حویلیاں کھول دیتے ہیں اور ان میں میڈرڈ، برشلونہ، پیرس تک کے مہمان بھر جاتے ہیں، پھر ایک سے ایک نفیس گاڑی نکالی جاتی ہے اور ان میں اچھی نسل کے گھوڑے یا اعلیٰ درجے کے خچر جُتے ہوتے ہیں اور بڑٖے دھوم دھڑکے سے بازاروں میں پھرتے ہیں. میلے کے میدانوں میں جوان مرد و عورت گھوڑوں پر گشت لگاتے یا شہر میں ان کی ٹولیاں رنگ برنگ کے دیہاتی لباس میں گھومتی پھرتی ہیں.

سپین میں بزرگوں کی درگاہوں کی زیارت کرنا Romeria کہلاتا ہے. سپین کے بہت سے باشندے زیارتیں کرتے ہیں لیکن اشبیلیہ والوں نے اپنی سلیقہ مندی سے اسے بھی نہایت رنگین اور لطف انگیز چیز بنا دیا ہے. اس قسم کی ایک بہت بارونق زیارت (Romeria del Roceo) کا میلہ آمد گرما میں ایسٹر کے بعد ساتویں (Whitsum) "دھولے اتوار" کو ہوتا ہے. اشبیلیہ شہر سے زائرین چلتے اور دریا پار تریانہ سے گزر کر میدانوں میں پھیل جاتے ہیں. جوان عورتیں جالیاں اور شال ڈالے، مرد چیچٹ کلس کی سخت ٹوپیاں اور نیم آستین پہنے اچھے سے اچھے لباس میں نکلتے اور دو پہیہ گھوڑا گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں. گاڑیوں کا قافلہ شور کرتا میدان میں نکلتا ہے تو ہر طرف سے زائرین، گاڑیوں میں اور

گھوڑوں پر یا پیدل آ آ کر اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ سیر تین دن کی ہوتی ہے۔ رات کو پڑاؤ لگا کے زائرین بڑی دیر تک ناچ گانے میں مشغول رہتے ہیں۔

تریانہ دریا پار اشبیلیہ کی نواحی بستی ہے یہاں خانہ بدوش جپسی اور ملاح آباد ہیں۔ گنجان، غل غپاڑے کی بستی ہے۔ جہاں آپ کو ایسے آدمی نظر پڑیں گے جو سولھویں صدی کے کسی عیاروں کے افسانوں کے افراد سے مشابہ ہوں گے۔ یہاں گدھوں کی آمد و رفت آپ کی موٹر کو تیز نہیں چلنے دے گی۔ خچر کے ریہڑے دھڑ دھڑ کرتے سڑکوں پر دوڑتے ہوں گے۔ لوگ ایندھن گھانس یا کھپریل کے بڑے بڑے گٹھے کمر پر لادے نظر آئیں گے۔ یہاں آپ کو زین سازی کی دکانیں اور سان بٹھانے والے بڑی کثرت سے ملیں گے کیونکہ جپسیوں کے یہ دو خاص پیشے ہیں۔

اندلسیہ اور ملی ہوئی ولایت مرقیہ میں ہزاروں جپسی رہتے ہیں۔ یہ لوگ پندرہویں صدی کے وسط میں ہسپانیہ آئے تو گرم موسم، زیتون اور پھلوں کی وجہ سے انھیں جنوبی علاقے پسند آئے۔ یہاں کے مویشی اور گھوڑوں کی اچھی نسلیں بھی پسند آئیں۔ اور ان کی تجارت میں اُنھوں نے سادہ لوح دیہاتیوں کو نقصان دے کر خوب نفع کمایا۔ وہ جگہ میلے تہواروں میں گھومتے پھرتے تھے۔ مرد گھوڑوں، خچروں کی تجارت میں چالاکیاں کرتے، عورتیں قسمت کا حال بتاتی، عاشق بنانے کی دوائیں بیچتی ہیں۔ یہ پھٹے پرانے کپڑوں میں گندے لوگ بارہا اکیلے دُکیلے مسافروں کو لوٹ لیتے اور مار بھی ڈالتے تھے۔ سپین کے قانون میں اُن دنوں جپسیوں کو بھیڑ کی اون کاٹنے، کھیتوں میں سخت محنت مشقت کرنے کسی ویران جنگلی مقام پر سرائے چلانے کے سوا اور کوئی پیشہ یا تجارت کرنے کی اجازت نہ تھی۔ محکمۂ احتساب نے ان کو ناقابلِ اصلاح سمجھ کر چھوڑ رکھا تھا اور اپنے عقائد میں وہ قریب قریب جاہلی ... پرست لوگ تھے۔ ایک انگریز ان کی بولی ایسی اچھی بولتا اور ان کے طور طریق سے ایسا واقف تھا کہ وہ اسے اپنی قوم کا آدمی سمجھتے تھے۔ وہ لکھتا ہے

کہ ان لوگوں کو حیات بعد ممات کا بھی اعتقاد نہیں تھا۔ سپین کے ایک جپسی نے اس سے سوال کیا تھا کہ "جب اسی زندگی میں ہم ایسے بد اعمال اور خراب و خوار رہے تو پھر دوبارہ زندہ کیے جانے کی کیا ضرورت ہے؟" پھر تدریجاً قوانین نرم ہوئے اور جنھوں نے آوارہ گردی ترک کر دی انھیں اپنی مرضی کے مطابق ہر طرح کا کام کرنے کی اجازت مل گئی چنانچہ بعض نے اپنی بولی اور وضع چھوڑ دی، لیکن مجموعی طور پر دوسرے ملکوں کی طرح سپین میں بھی وہ اپنی قبائلی طرزِ معاشرت پر برابر قائم رہے۔ سپین کے دیہاتی لوگ ابھی تک ان پر بھروسہ نہیں کرتے بلکہ اُن سے عناد رکھتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ پچھلی خانہ جنگی میں تقریباً آدھے جپسی جو ملک میں گھومتے پھرتے تھے، لوگوں نے حملے کر کے انھیں ہلاک کر دیا۔

جپسی سپین کی فنی زندگی میں اچھا خاصا حصہ لیتے رہے، خصوصاً اندلسیہ میں جو ان کے رقص و سرود سے شاد ہوئی۔ بہت سے جپسی گاوزن بھی ہیں۔ پھر غرناطہ میں بیرونی سیاحوں کے لیے قصر الحمرا میں جیسی دلکشی ہے، قریب قریب اسی قدر کشش جپسی رکھتے ہیں۔ ان کی عورتیں بڑے بڑے سیدھے یا چنٹ پڑے لہنگوں میں، موٹے بالوں کے اونچے چٹلے باندھے، کانوں میں سونے کے بھاری بُندے لٹکائے شہر میں ہر جگہ پھرتی نظر آتی ہیں۔ شہر کے قدیم حصے میں وہ ال بکین محلے میں رہتے ہیں۔ وہاں غاروں میں ان کے گھر اور ناچ دیکھنے لوگ جاتے ہیں لیکن یہ محلہ اب کاروباری چیز ہو گیا ہے اور سیاحوں کی آمد بہا کا ذریعۂ معاش بن گئی ہے۔ جپسی رنڈیاں جو وہاں ناچتی ہیں اب ولایتی لاکھا دلپ سٹک، حجامتی اور ناخن رنگواتی ہیں۔ ان کے غاروں کے مکان نہ صرف صاف ستھرے بلکہ جدید اسباب آرائش سے معمور ہیں، باوجود اس کے اندلسیہ کے متصل ولایت مرقیہ میں واقعی جپسی غاروں کی بستیاں موجود ہیں اور ہزاروں نفوس پہاڑیوں کے دامن میں مٹی کھود کھود کے اندر گھر بنا لیتے ہیں اور اسی گرد و غبار، گندگی اور افریقی گرمی میں زندگی

بسر کرتے ہیں۔

اگر آپ کا اندلسیہ میں خود جانا نہ ہو، تو بھی ایک جدید اندلسی شاعر نے، قلم کے زور سے اس ولایت کو ہم سے اتنا قریب کر دیا ہے کہ اس کی تحریروں میں ہم وہاں کی گرمی محسوس کرتے، وہاں کے تیل، خون اور پھولوں کی بو سونگھتے اور اس کے راگ سننے لگتے ہیں، وہ آپ کو سانڈوں کے دنگل میں، روندہ کی گہری گھاٹی میں جہاں سانڈوں کے سینگ کھا کے مرے ہوے گھوڑے دفن کیئے گئے ہیں لے جائے گا، جپسیوں سے تعارف کرائے گا، رقص و سرود کے ساتھ قتل و خون کے منظر دکھائے گا، اہلِ رومہ غوطی اور موری سلاطین کی داستان سنائے گا ـــ یہ شاعر گارشیا لورکا (Garcia Lorca) ہے کہ تھوڑی عمر پائی مگر نظمیں ایسی لکھ گیا کہ معلوم ہوتا ہے قلب وطن کی گہرائیوں سے پھوٹ کر نکلے ہیں۔ اس نے romance (= چوپالی) کی قدیم صنف کو زندہ کیا جو کسی زمانے میں سپین میں بہت مقبول تھی۔ پھر اس سے عشق و انتقام اور جنگ کے کارنامے بیان کرنے کا کام لیا۔ ان کے کتابی صورت میں چھپنے سے قبل ہی شاعر کے ساتھی طالب علم غرناطہ اور میڈرڈ کی بڑی درسگاہوں میں یہ نظمیں اسی طرح گاتے پھرتے تھے جس طرح قرونِ وسطیٰ کے محوش گلو بھاٹوں کے گیت گھر گھر زبان زد ہو جاتے تھے۔ گارشیا نے ناٹک بھی لکھے جن میں اہلِ سپین کے خاص اوصاف یعنی بہادری شوقِ ناموری اور دنیاوی مال و منال کی تحقیر کا اظہار ہوتا ہے۔ اگرچہ اس نے صرف اندلسیہ کی سرزمین، یہاں کے دیہات اور شہروں پر غرناطہ، قرطبہ اور اشبیلیہ اس کے دل پسند شہر ہیں۔) لکھا لیکن سچ پوچھیے تو اس کی تصانیف پورے سپین کی خصوصیات پر حاوی نظر آتی ہیں۔

گارشیا لورکا خانہ جنگی کے آغاز ہی میں بہ مقام غرناطہ مارا گیا۔ پہلے خیال کیا جاتا تھا کہ قوم پرستوں نے اسے قتل کیا لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ جرم سیاسی نوعیت کا نہ تھا بلکہ کسی شخص نے ذاتی دشمنی کی بنا پر اسے مارا۔ اس کی شاعری جدید ادبیات میں بلند مقام رکھتی

ہے اور اکثر تصانیف انگریزی میں ترجمہ کر لی گئی ہیں۔ دو ایک نمونے (اُردو ترجمے میں) ملاحظہ ہوں:۔

چھیتارا (la Guitarra)

"چھڑا جو نالۂ حزیں
چھیتاریا کا ایک بار
تو پھر نہ رُک سکے گا وہ
یہ سعی ہی فضول ہے۔
وہ یونہی روئے جائے گا
مثالِ ابر بوند بوند
گری چلی ہی جائے گی
ہوائے تیز اسی طرح
پہاڑیوں پہ برف کی
ہوئی ہے اشک ریز بھی
محال ہے کہ رک سکے
یہ نالۂ چھیتاریا
کہ ہے یہ ان کے سوگ میں
جو اَب نظر سے ہیں نہاں
بعید و گرم ریگ زار
ہو جس طرح سے بے قرار
گُلِ سفید کے لیے۔"

ایک تمثیل میں رَوندہ میں سانڈ کی لڑائی کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے:۔

رَوندہ کے قدیمی دنگل میں

یہ معرکہ سب سے بڑھ کر تھا
وہ پانچ بجار تھے کالے بھجنگ
اور ہار گلاب کے ڈالے تھے۔"

اس کشتی کو دیکھنے کے لیے خلقت ٹوٹ پڑی تھی ۔ عورت، مرد طرح طرح کی گاڑیوں میں تانگوں میں، گھوڑوں پر، رنگ برنگ کے کپڑے پہنے، بانکے بنے چلے آرہے تھے، سارا دنگل تماشائیوں سے پٹ گیا تھا، جب کہ

"گڈیل کیتا نو نکلا
دنگل کی بھوری ریتی پر
ریشم کے نفیس لبادے پر
چاندی کے کام کے ٹکے تھے....
سب گاؤ زوروں میں دنگل کے
وہ سب سے بلند و نمایاں تھا۔
وہ اس کا توازن وہ تمکین
وہ پاؤں بڑھانا کاوے سے
جیسے کوئی پانی پر تیرے....."

اس کے بعد پانچوں بجاروں سے کیتا نو لڑتا اور انھیں مار ڈالتا ہے۔ اتنی بڑی اور حیرت انگیز کامیابی پر:

"دنگل میں ایسا شور اٹھا
اس شام زمین لرزنے لگی
اور قلۂ کوہ بھٹکنے لگے...."

باب چہاردہم

شمال میں

جب ہم قستالیہ کا نام لیتے ہیں تو صرف شہر میڈرڈ کا ہی خیال نہیں آتا کیونکہ وہاں طلیطلہ وغیرہ اور کئی مشہور شہر موجود ہیں۔ اسی طرح اندلسیہ میں صرف اشبیلیہ ہی لائق ذکر شہر نہیں ہے۔ لیکن ان علاقوں کے برخلاف ولایت قیطلونیہ کا واحد نمائندہ شہر برشلونہ ہے۔ اور وہ پوری ولایت کا قریب قریب مترادف ہی ہوگیا ہے۔ اس کی حدود میں دوسرا کوئی اہم شہر نہیں ہے۔ تراگونہ جو برشلونہ سے زیادہ دور نہیں، ایک زمانے میں بے شبہ سپین کا دارالحکومت ہوگیا تھا۔ اور اس کی دس لاکھ آبادی تھی، لیکن یہ اہل رومہ کے عہد کی بات اب قصۂ پارینہ ہوچکی ہے، آجکل تراگونہ معمولی اور اونگھتی ہوئی صوبائی بستی رہ گیا ہے۔ ادھر برشلونہ سپین کا سب سے دولت مند تجارتی شہر ہے اور اسی کے ساتھ وہ کم "ہسپانوی" اور اصلی معنی میں "قیطلونی" ہے۔ واضح رہے کہ اس ولایت کے لوگ سپین کے دوسرے باشندوں سے کئی اعتبار سے مختلف ہیں۔ ان میں قستالوی متانت اور اندلسیہ کی نیم مشرقی دلکشی آپ کو نہیں ملے گی۔ ان کے شہر کا بھی یہی حال ہے۔ برشلونہ کے ہنگامے اور سامانِ عشرت میں آپ کو زوالِ دولت کے وہ آثار نہیں نظر آئیں گے جس کا بوجھ آپ کو قستالیہ میں محسوس ہوتا ہے اور اہل اندلسیہ کی خوابناک سستی۔ اس کی بجائے آپ خود کو زمانہ شناس، دنیادار، محنتی، خوش حال، دوست دار قیطلونیوں کے درمیان پائیں گے لیکن جدید طور طریق اور نئی صورتوں کے باوجود برشلونہ کو اپنے ماضی پر بھی فخر ہے۔ جس کا سلسلہ بہت دور فلیقیہ اور قرطاجنہ تک گیا ہے۔ شہر کی بنیاد قرطاجنی سپہ سالار ہملکار برقا نے تیسری صدی ق م

میں ایک سابقہ فنیقی بستی کے مقام پر رکھی اور اسنے اپنے خاندان کے نام پر برقنا موسوم کیا تھا۔ قرطاجنہ کی رومیوں سے شکست کے بعد بھی یہ ایک بڑا شہر تھا۔ اگرچہ قریب کے ترّاگونہ کے برابر اسے وقعت حاصل نہ تھی۔ اس میں ایک "غوطی محلّہ" بھی موجود ہے کہ پندرھویں صدی سے آج تک اس میں بہت کم تبدیلی ہوئی ہے۔ آس پاس کی کھدائیوں میں رومہ اور وِس گاتھ (غوطی) عہد کی یادگار ہے آپ شہر برشلونہ کے عجائب گھر میں دیکھ سکتے ہیں۔ غوطی محلّے میں کلیسائے برشلونہ اس مقام پر ایستادہ ہے جہاں پہلے غوطی بادشاہوں نے گرجا بنایا، پھر مور فاتحین کی مسجد تیار ہوئی۔ کلیسا میں اعلیٰ درجے کے منقّش شیشے اور دوسرے نوادر بھی ہیں، لیکن اس قدر تاریک ہے کہ سپین کے اکثر تاریک گرجے بھی اتنے اندھیرے نہیں ہیں۔ عجب نہیں آپ اس کی تاریکی سے گھبرا کر باہر آجائیں اور تسبیح خانوں کے سنترے اور میگ نولیہ (=گلاب) کے درختوں کے سائے میں وقت گزارنا پسند کریں۔ کلیسا کے گرد و جوار میں ایسی کئی زیارت گاہیں ہیں اور محلّے کی پتلی پتلی گلیاں بل کھاتی ہوئی بعض پرانی وضع کی عجیب دکانوں کے سامنے سے گزرتی ہیں اور کہیں کہیں چوڑی ہوگئی ہیں کہ بڑے دلکش قدیم چوک بن گئے ہیں۔

برشلونہ کی عہد ماضی کی متین عمارتوں کے مقابلے میں بعض جدید عمارتیں ایسی عجیب نظر آئیں گی جیسے کسی سینما کی افسانوی تصویریں ہوتی ہیں۔ اس افراط پسندی کی سب سے معروف مثال ناتمام "چرچ اوف دی ہولی فیمیلی" ہے کہ تقریباً بیس برس سے اس کی تعمیر رُکی پڑی ہے اور یقین کرنا مشکل ہے کہ اصل نقشے کے مطابق کوئی معمار اس کی تکمیل کر سکے گا۔ کیونکہ اصلی بنانے والے "ان تونیو گودی" نے اسے بڑے بڑے جھنڈوں، فیتے کی سی کمانوں، درختوں، پھولوں وغیرہ، طرح طرح کی چیزوں کو گڈ مڈ کر کے عجیب و غریب معجون مرکب بنایا تھا، جیسے پتھر کی بجائے کوئی اسفنج کو توڑ موڑ کر بنائے ــــ حقیقت میں یہ معمار بھی قیطلونیہ کے انھی کثیر ارباب فن میں شمار ہوتا ہے، جنھوں نے بیسویں صدی میں تمام قدیم اور مروجہ روایات کو توڑ پھوڑ کر

بالکل نئے اور نرالے انداز میں اظہارِ کمال پر کمر باندھی۔ اس بغاوت میں بہت سے مصوّر بھی شریک ہوئے، جن میں تین اس ملک میں سب سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں، یعنی پکاسو، والی اور ہرو۔ اِن میں (Salvador Dali) کی نسبت جب آپ سنیں کہ وہ قیطلونی (لہذا باغی) ہے تو پھر آپ کو یہ سمجھنا آسان ہوگا کہ فن پر اتنی قدرت رکھنے کے باوجود، اس نے یہ مجنونانہ طرز کا کام اس سے کیوں لیا؛ وہ اپنی تصاویر میں بڑی بھیانک شکلیں، ڈھانچے، ٹیڑھے بڑنگے درخت، کہیں گھڑی گھنٹے، کہیں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سب یکجا اس طرح دکھاتا ہے جیسے بدخوابی میں نظر آیا کرتے ہیں۔ مگر ہر شے کی نقاشی ایسی باریکی اور احتیاط سے کرتا ہے کہ کوئی دلندیزی اصلی مناظر دکھانے میں بھی ایسی عرق ریزی نہ کرتا ہوگا۔ مگر صرف چند ہی اس کی تصویریں ایسی ہیں کہ آدمی کو سمجھنے میں اُلجھن نہیں ہوتی ہے۔ وہ اُن سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ اس میں برشلونہ کی ریتی کے قریب قریب خالی مناظر اور خود اس کی بیوی کی خیالی دو رُخی تصویر، شمار کرسکتے ہیں۔ بایں ہمہ اس کے مجموعی کام کو پیش نظر رکھیئے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ مصوّر نے جو ارادہ کیا تھا کہ "میں دیوانوں کی طرح نقاشی کروں گا"، وہ پورا کر دکھایا۔

دوسرا مصور (Pablo Picasso) عصرِ حاضر کے ممتاز اہلِ فن میں شامل ہے۔ وہ مختلف اسالیب کو ماہرانہ استعمال کرسکتا ہے، اسی لیے والی کی تصاویر کی طرح آپ اس کی تصاویر کو آسانی سے شناخت نہیں کرسکتے۔ پکاسو نے برشلونہ میں پرورش پائی اور سنہ ۱۸۹۰ء میں اس شہر میں فن کی سخت قیود و روایات کے خلاف جو ہنگامہ برپا ہوا، وہ بھی اس کی لپیٹ میں آیا، چنانچہ آگے چل کر اس "مکعبی" تحریک کے بانیوں میں وہ بھی شریک تھا جو اس صدی کے پہلے اور دوسرے عشرے میں انقلابی خیال کی جاتی تھی۔ مگر معمولی یا رسمی تصویروں میں اس کا میلان مضحک شکلیں بنانے کی طرف ہے۔ وہ انسانی جسم کو کبھی بہت لمبا، کبھی سوکھا، کبھی غبارے کی طرح پھولا ہوا دکھا کر طرح طرح سے مسخ کرتا ہے۔ کشتی کرتب دکھانے والے اور نٹ، دھندلی اور بھوری زمین پر نیلی اور لمبوتری شکلوں میں اُبھرے ہوئے ہیں۔ اس کی نقاشی کا ایک دَور ہی نیلا دور کہلاتا ہے

یہ اسی دور کی صورت گری ہے۔ دوسری تصاویر میں گاؤزن، نچلیے، کنھک، بھانڈ نمایاں ہیں۔ انھیں کسی قدر شوخ رنگ دے کر زندگی اور ظرافت پیدا کی گئی ہے۔

قیطلونیہ کا تیسرا نقاش Joan Miro (مِرَو) اول درجے کے اہل فن میں شمار نہ ہو تو بھی اس کی تصویریں، آزادی، جوانی، خوش دلی کی عکاسی کرتی ہیں۔ ایک تصویر "بے قرار پرندہ ٹکٹکی لگائے"، نیلے اور سرخ رنگوں کی آمیزش کا دل پسند مجموعہ ہے — اپنی پیدائش کے گاؤں "مونٹ رواگ" کی تصویر قرونِ وسطیٰ کی کسی قلمی کتاب کا مرقع معلوم ہوتی ہے جس میں سفید سفید مکانوں کے جھنڈ اُفق کی طرف اور اِدھر اُدھر کھیتوں کے گلابی، دھانی، سبز رنگ کے قطعے نہایت نظر فریب بنائے ہیں۔

قیطلونیہ والے صدیوں سے مرکزی حکومت کی بالادستی سے ناراض رہے اور بارہا بغاوتیں کیں۔ اسی طرح فن میں کسی کی بالادستی انھیں پسند نہیں۔ خاص طور پر وہ قستالیہ کے تسلط سے بیزار ہوتے ہیں۔ برشلونہ کے ذی فہم اور خوش حال شہری صاف صاف کہہ دیتے ہیں کہ اگر قستالیہ پورے سپین کی نمایندہ ہے، تو ہم "سپینی" نہیں بلکہ "قیطلونی" ہیں۔ ان کا یہ قول کہ ہم کسی متحدہ سپین کے نظام میں آزاد قوم بن کر رہنا چاہتے ہیں، (اور اسے وہ اکثر دُہراتے ہیں) اس ولایت کے اکثر باشندوں کی سچی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب تک ارغون کے رئیس فردیناند نے اپنی لڑکی ازابلا کی والیٔ قستالیہ سے شادی نہیں کی تھی ہماری قیطلونیہ کسی طرح قستالیہ سے کم ممتاز نہ تھی۔ اس کا رقبہ کم تھا لیکن دولت اور تعلیم و تہذیب میں اسے فوقیت حاصل تھی مذکورہ بالا شادی نے قستالیہ کی جابرانہ حکومت کا طوق ہمارے گلے میں ڈال دیا۔ وہ اپنے برشلونہ کے رئیسوں کی (جو ارغون کے بادشاہ بھی ہوتے تھے) فتوحات گنواتے ہیں۔ کہ بلیارک اور دوسرے بحرِ روم کے جزیرے انھیں نے فتح کیے بلکہ قرونِ وسطیٰ میں یونان کے شہر ایتھنز تک میں اپنی نوابی قائم کی۔ انھیں آج تک یہ بات یاد کر کے غصہ آجاتا ہے کہ ازابلا اور ہیپس برگ بادشاہوں نے اہلِ قیطلونیہ کو نئی دنیا کی دریافت اور تجارت و آبادکاری کے نفع میں حصہ لینے سے حکماً روک دیا

تھا۔ اس بات کے ثبوت میں کہ انھیں قشتالیہ سے علاحدہ ہونے کا حق حاصل ہے، وہ اپنی قیطلونی زبان کے مختلف ہونے کی دلیل پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ قیطلونی زبان ہسپینی کی شاخ نہیں ہے بلکہ براہ راست لاطینی سے اسی طرح بنی ہے جس طرح ہسپینی، پرتگالی، فرانسیسی زبانیں بنی ہیں۔ فرانسیسی سے وہ بہت ملتی جلتی ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں قیطلونیہ کا ادب یورپ کے دوسرے ملکوں کا مقابلہ کرتا تھا۔ اس میں بہت اچھی شاعری اور بہادری کی داستانیں تھیں۔ اس کی تاریخ کی کتابیں امتیاز رکھتی تھیں۔ بہترین تاریخ نویسوں میں ارغون کا بادشاہ اور برشلونہ کا نواب جیمیز فاتح گزرا ہے، جس کی غیر معمولی بلند قامتی خوبصورتی اور بہادری شہرۂ آفاق تھی۔ جزائر بلیارک اسی نے فتح کیے اور بلنشیہ کی ولایت کا اپنی مملکت سے الحاق کر لیا تھا، اٹھارویں صدی کے آغاز تک سپین کے مشرقی سواحل بحرِ روم، بعض جزائر اور جنوبی فرانس کے بعض اقطاع میں قیطلونی زبان بولی جاتی تھی۔ یہاں کے لوگوں نے غلطی سے فلپ پنجم (بوربون) کے مقابلے میں شہزادہ چارلس (آسٹڑوی) کا ساتھ دیا تھا۔ اسی کی سزا میں فلپ نے تخت جیتنے کے بعد مدارس اور عدالت نیز طباعت میں قیطلونی زبان سے کام لینے کی ممانعت کر دی۔ حال میں قیطلونی وطن پرستوں نے اسے دوبارہ مروج کرنے کی کوشش کی تھی مگر کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی خصوصاً اس لیے کہ فرانکو کی حکومت نے بھی اس کے استعمال پر بعض قیود عاید کر دی ہیں۔

برشلونہ جیسے شہر کے پرجوش اور جاندار باشندے اگر ناراض ہوں تو ظاہر ہے کہ ان کی توانائی مخالفت کا راستہ اختیار کرے گی۔ برشلونہ خوشی سے مگن نہ ہو اور قیطلونی عیش و نشاط سے لطف نہ اٹھا رہے ہوں، تو نفرت اور تخریب کے جذبات ان کے دل میں جوش زن ہوں گے۔ ہر صدی میں ہم بار بار یہاں بلوے اور فساد ہوتے دیکھتے ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر میں خونی ہڑتالیں، بم بازی، قتل و خون کی وارداتیں سنتے ہیں اور اسی قسم کے فسادات سے بیسویں صدی کے ابتدائی سنین آلودہ ہیں۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک کی خانہ جنگی میں

برشلونہ فرانکو کے دشمنوں کا گڑھ بن گیا تھا اور بار بار بم باری کا ہدف بنا۔ جنگ کے خاتمے پر چار دن تک پامال و تاراج کیا گیا کہ شہر کے بعض حصے کھنڈر ہو گئے۔ نواح کے بہت سے خوش حال قیطلونی دیہات جنگ میں تباہ ہوئے اور کئی پرانے نفیس گرجے انارکسٹوں نے، جو شاہ پرستوں میں ملے ہوئے تھے اجاڑ ڈالے یا قوم پرستوں کی بمباری سے منہدم ہوئے۔ قیطلونیہ میں آزادی کی تحریک کو اشتراکیت نے پیچیدہ بنا دیا ہے اور یہ پیش گوئی کرنا مشکل ہے کہ آیندہ وہاں کیا ہو گا؛

سپین میں صوبائی مخالفتوں کے دوسرے مسائل بھی موجود ہیں۔ مثلاً باسک قوم کا معاملہ کہ ان کے اضلاع بھی آزاد حیثیت کے طلب گار ہیں۔ اگرچہ اس میں وہ شدت و تواتر نہیں ہے۔ ایام گذشتہ میں قیطلونیہ کی طرح یہ علاقے بھی جنگی خدمت اور بعض محاصل سے مستثنیٰ تھے۔ لیکن انیسویں صدی میں ان مراعات سے محروم ہو گئے۔ پھر ان کی اپنی زبان بھی، یورپ میں سب سے انوکھی، موجود ہے۔ کسی کو ٹھیک نہیں معلوم کہ اس قوم کی اصل کیا ہے اور ان کی زبان کہاں سے آئی۔ بعض اہل علم انہیں ایک قدیم نسل کی جو ایبریوں کی آمد سے پہلے اس جزیرہ نما میں آباد تھی، باقیات خیال کرتے ہیں۔ باسک بولی کی نسبت یہ قیاس ہے کہ کسی قدیم ایبری زبان کی موجودہ صورت ہے۔ ایبری سے اس کی مشابہت اکثر اہل الرائے کے نزدیک مسلمہ ہے لیکن ایبری تحریر کے نمونے یعنی صرف چند کتبے باقی ہیں لہذا مذکورہ تعلق کو ثابت کرنا غیر ممکن ہے۔ چند سال ہوئے ایک شہادت کی جھلک دکھائی دی تھی کہ بلنشیہ کی کھدائی میں ایک صراحی دبی ہوئی نکلی جس پر ایک بحری لڑائی کا نقشہ اور نیچے دو ایبری لفظ لکھے تھے۔ ان کے سمجھنے میں باسک زبان سے کام لیا تو ان کا ترجمہ "نعرۂ جنگ" ہوا۔ بایں ہمہ یہ اندھیرے میں ایک کرن کا چمکارا سا تھا کیونکہ بعد میں دوسرے بڑے کتبوں کے معنی نکالنے میں باسک زبان سے کوئی یقینی نتائج حاصل نہیں ہوئے۔ خود باسکوں سے پوچھیے تو وہ اپنی زبان کو حضرت آدمؑ کے

وقت کی بتائیں گے جو باغ عدن (یعنی جنت) میں بولی جاتی تھی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ شیطان اس بولی کو سیکھنا چاہتا تھا اور سات برس تک محنت کرتا رہا۔ پھر بھی صرف تین لفظ ٹھیک ٹھیک سیکھ سکا، لہذا اس نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ واقعی میں جب آپ اس زبان کی ۲۵ مختلف شاخوں اور ان کی دشوار صرف نحو پر غور کریں اور ایک ایک لفظ میں کئی کئی حرفوں کی اجھٹیاں دیکھیں جیسے یہ خاندانی نام: Zumalcarregui zuzagoitia Goicoechea , azpail Koeta تو آپ بچارے شیطان کی بے سود محنت پر ترس کھائے بغیر نہ رہیں گے۔

باسک سادہ معاشرت کے مضبوط اور دلیر لوگ ہیں دصدیوں سے ممنوعہ اشیاء کو فرانس و سپین کی سرحدوں کے پار چوری چھپے لانا، لے جانا ان کا پیشہ رہا ہے، عقائد میں تنگدل، سخت، پکے رومن کیتھولک اور آزادی کے لیے لڑنے مرنے والے ہیں۔ متعصب ڈون کارلوس کے ساتھ ہو کر انیسویں صدی میں کارلوی لڑائیاں لڑتے رہے لیکن گزشتہ خانہ جنگی میں کیتھولک دشمن شاہ پرستوں کے طرف دار ہو گئے تھے کیونکہ اپنے مذہبی عقیدے میں پختہ ہونے کے باوجود وہ قدامت پسند جنرل فرانکو کی نسبت آزاد خیال شاہ پرستوں سے زیادہ امید رکھتے تھے کہ باسکوں کو مقامی آزادی دے دیں گے۔ ۱۹۳۷ میں جرمن ہوابازوں نے فرانکو کا حامی بن کر باسکوں کے قدیم شہر گوئرنیکا پر بم برسائے، جہاں صدیوں سے ان کی قومی پنچایت ایک مقدس بلوط کی چھاؤں میں لگا کرتی تھی۔ شہر قریب قریب خاک کا ڈھیر ہو گیا تھا اور اس ہوائی حملے پر دنیا بھر میں فضیحت کی گئی تھی لیکن جنگ کے بعد گوئرنیکا پھر خوش وضع شہر بنا دیا گیا ہے۔ مقدس بلوط کا صرف ٹھنٹ رہ گیا ہے لہذا پنچایت اب ایک اور بلوط کے نیچے ہونے لگی ہے جسے سو برس پہلے لگایا گیا تھا۔

کیتھولک گرجا، گوئرنیکا بلوط اور کھیل کا فرش "فروں توں" تین علامتیں ہیں جن سے باسکوں کی زندگی میں ان کی دین داری، آزادی اور ایک خاص کھیل "پلوتا" کے شوق کا پتا چلتا ہے۔ پلوتا ٹینس کی طرز کا کھیل ہے مگر اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ کھیلا جاتا ہے۔ اسے عموماً دو اِدھر دو اُدھر، چار آدمی کھیلتے ہیں۔ ہر ایک کی کلائی پر چنگیر سی بندھی ہوتی ہے جس پر گیند لینے اور دوسری طرف پھینکتے ہیں۔ یہ کھیل فروں توں یعنی سیمنٹ کے پختہ میدان پر کھیلا جاتا ہے اور میدان کے تین رُخ اونچی دیواروں سے گھرے ہوتے ہیں۔ کھیلنے والوں کو ہر طرف مڑتے تڑتے، دوڑ دوڑ کر اُچھلتے اور بے قابو گیند کو قابو

میں لانے کی جد وجہد آپ دیکھیں گے تو اس قول کا یقین لے آئیں گے کہ یہ اتنی مشقت کا کھیل ہے کہ پلوتا باز جوانی ہی میں مر جاتے ہیں۔ باسکوں کے ہر گاؤں میں "فرون توں" ہوتا ہے۔ اکثر گرجا کی عقبی دیوار اس کی ایک دیوار کا کام دیتی ہے اور بڑی بستیوں میں تو ظاہر ہے کہ یہ کھیل جگہ جگہ کھیلا جاتا ہے، نہ صرف سپین کے بڑے شہروں میں بلکہ میکسیکو شہر اور ہوانا میں بھی پلوتا بہت مقبول ہے اور پیشہ وروں کا کھیل ہو گیا ہے اور اس کی ہر بازی پر شرطیں بدی جاتی ہیں

شمال مغرب میں گلیشیہ کی بھی باسک اور قیطلونی کی طرح ایک علاقائی زبان ہے مگر یہ محض پرتگیزی کی ایک شاخ ہے۔ یہاں کے باشندے سلت یا کیلٹ قوم کی براہ راست اولاد میں سے ہیں جو زمانہ دراز پہلے سپین میں آئی تھی۔ ان کی صورت سے آج بھی نسل کا پتہ چلتا ہے اور وہ ہو بہو اسکاچ یا آئرستانی معلوم ہوتے ہیں۔ بین بجانے کے شائق ہیں اور آئرستانیوں کی طرح بید یا شیلیلاغ ہاتھ میں لے کر چوبی جوتیاں پہنے اپنی سیلی کھُرلی سرزمین کے کیچڑ پانی میں سپڑ سپڑ کرتے پھرتے ہیں۔ ان میں بہت سے توہمات پھیلے ہوئے ہیں اور اپنے جنگلوں، پہاڑوں، آبشاروں اور سرراہ زیارتوں کے متعلق عجیب عجیب افسانے ان کو یاد ہیں۔ وہ طبعاً شاعر اور خیالی قسم کے لوگ ہیں۔ کچھ مدت پہلے سپین والے اپنی تمثیلات اور ناٹکوں میں گلیشی کو ہمیشہ مسخرے کی صورت میں پیش کرتے تھے کہ جہل و حماقت کے ساتھ بہت مطلبی اور ضدی ہوتا تھا لیکن یہ مضحکہ خیز کردار اہل گلیشیہ کی اکثریت کا صحیح خاکہ نہیں ہے کیونکہ ادنیٰ درجے کے محنت مشقت کے کام جیسے کھیت کے مزدور، حمال، ملاح، پولس کے سپاہی ہونے کے باوجود گلیشیہ کے لوگ ذہانت اور ہنرمندی سے عاری نہیں ہیں۔ ان کے بہت سے افراد، سیاسیات، ادبیات اور دوسرے پیشوں میں امتیاز حاصل کر چکے ہیں۔ بہت سے یورپ اور امریکہ کے ملکوں میں جا بسے ہیں کہ اپنے چھوٹے چھوٹے پہاڑی کھیتوں سے جو نفع حاصل نہیں کر سکتے، وہ اور اس سے زیادہ بیرونی ملکوں میں کما سکیں۔ اس بات کا اندازہ کہ کتنی بڑی تعداد میں یہاں کے مرد باہر گئے ہیں، آپ اُس وقت بخوبی کریں گے جب یہ دیکھیں کہ وہاں کھیتوں میں عورتیں زیادہ تعداد میں کام کر رہی ہیں یا وہاں کے قصبوں میں شام کی سیر و تفریح اس لیے بے مزہ ہوتی جاتی ہے کہ چوک میں عورتوں اور لڑکیوں کی ٹولیاں پھر رہی ہیں لیکن مرد اور لڑکے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔

باب پانزدہم

سپینیوں کی سپینیت

جیسا کہ اوپر ہماری نظر سے گزرا، سپین کا ہر خطّہ دوسرے خطّوں سے مختلف ہے اور ہر خطے کے باشندے، دوسرے سے کچھ اپنے اوصاف خاص الگ رکھتے ہیں۔ گزشتہ سو سال سے زیادہ مدت کی تصانیف میں اس جداگانہ انفرادیت کا رنگ جھلکتا ہے۔ ناٹک اور ناول جو اس زمانے میں لکھے گئے، خصوصاً ناول وہ اپنے مقامی مناظر اور خصوصی کیفیات کو اس قدر نمایاں کرتے ہیں کہ قریب قریب ہر کتاب اپنے ہی خطے کی نمائندہ معلوم ہوتی ہے جو دوسرے خطے میں نہیں لکھی جا سکتی۔ ان کتابوں کا مطالعہ کرنے والا ایک الگ ہی دنیا میں اپنے آپ کو پاتا ہے اور چونکہ وہ عین حقیقت کے مطابق لکھی ہوئی ہوتی ہیں لہذا ان کی دل کشی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ان میں آپ مراگتو قوم (Maragatos) کی افسردہ معاشرت کا اصلی نقشہ دیکھتے ہیں۔ جو سپین کے شمال مغرب میں سب سے الگ تھلگ بڑے اسرار قسم کے لوگ ہیں اور بعض صاحبوں کے نزدیک انھی بربر مجاہدین کی اولاد ہیں جنھیں طارق ابن زیاد سپین لایا تھا۔ کبھی آپ اندلسیہ کی عشق و محبت کی داستانوں میں زیقین کی نت نئی ترنگوں کا لطف اُٹھائیں گے۔ کبھی باسک ملاحوں کی دلیریاں پڑھ کر جوش میں آئیں گے۔ کبھی ستاندر کی بندرگاہ کے آس پاس مچھیروں کے محلّوں میں گھومیں گے جن کے اونچے اونچے مگر بوسیدہ اور شکستہ مکان ایک دوسرے سے پیوستہ بنے ہوئے ہیں اور کبھی میڈرڈ کے عقبی، گھٹیا گلی کوچوں کے افلاس اور مصائب دیکھ کر صدمہ اٹھائیں گے۔

انیسویں صدی کے وسط سے گذشتہ خانہ جنگی تک کے زمانے میں بہت سے افسانے لکھے گئے۔ ان لکھنے والوں میں ہمارے ملک امریکا میں زیادہ شہرت بلاسکو ابانیز (Vicante Blasco Ibanez)

کو اس کی کتابوں کے انگریزی تراجم کے ذریعے سے حاصل ہوئی خصوصًا پہلی عالمگیر جنگ کے متعلق اس کے جوش انگیز افسانے چار آسمانی سوار (The Four Horsemen of the apocalypse) کی بدولت، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس مصنف نے اپنی ولایت بلنشیہ کے متعلق جو ناول لکھے ہیں، مذکورہ بالا افسانے سے بھی بہتر ہیں۔ ان میں شہر بلنشیہ کی نواح کے میوہ باغوں اور ترکاری کے چھوٹے چھوٹے سیراب باڑوں کے کاشتکاروں کی تصویریں بڑے اُنس و محبت کے ساتھ کھینچی گئی ہیں۔ ان کی دل کشی میں ابھی تک وہی تازگی ہے بحالیکہ "چار سوار" کا افسانہ اب قصۂ پارینہ معلوم ہونے لگا ہے۔ ابانیز کے ساتھ اور قریب قریب اسی زمانے میں اہل امریکہ سپین کے دو تمثیل نگاروں سے متعارف ہوئے۔ یہ بِناوِنت (Jacinto Benavente اور مارتینز سیرا (Martinez Sierra) ہیں۔ بِناوِنتِ کے انگریزی تراجم شائع کیے گئے۔ خصوصًا ۱۹۲۲ء میں اسے "نوبل پرائز" ملا تو اس کے بعد کئی انگریزی ترجمے امریکا میں چھپے۔ سیرا اپنے کھیل "پنگورے کا گیت" کے باعث یاد رکھنے کے قابل ہے۔ یہ ایک شیر خوار لڑکی کی درد و محبت بھری کہانی ہے جو ایک خانقاہ کے دروازے پر ڈال دی گئی تھی، وہاں کی راہبات نے اس کی پرورش کی یہاں تک کہ وہ جوان، محبت میں مبتلا اور کتخدا ہوئی۔ پالنے والیاں خوش ہوتی لیکن رو رو کے اسے رخصت کرتی ہیں۔ امریکہ میں اس قصے کی فلم مقبول تھی۔ اور شوقیہ ناٹک کرنے والے اب بھی کبھی کبھی اس کا تماشا دکھاتے ہیں۔

سپین کے تھیٹر کو چھوڑنے سے پہلے ہمیں ایک اور تمثیل نگار گتیرز کا تذکرہ کرنا ضروری ہے جو کسی قدر پہلے مگر اسی انیسویں صدی میں گزرا ہے۔ اس کی المیہ تمثیل ال ترووَدور (El Trovador) ۱۸۵۳ء کی تصنیف ہے۔ موسیقی کے استاد وردی (Verdi). پر اس تمثیل کا ایسا اثر پڑا کہ اس نے اپنی اسی نام کی سنگت اس قصے کی بنیاد پر تیار کی اور گتیرز کے ایک اور ناٹک "Simon Bocanezro" سے بھی یہی کام لیا۔

سپین و امریکا کی جنگ ۱۸۹۸ء کے بعد تاریخ نویسوں، فلسفیوں، صحافیوں اور نقادوں

کا ایک گروہ پیدا ہوا جو اپنے آپ کو "نسل ۱۸۹۸ء" موسوم کرتا تھا، اس کی تحریر کا موضوع سپین کی شکست اور قومی کمزوری کے اسباب دریافت کرنا تھا۔ ان میں ہر صاحب قلم خرابی کا مداوی بھی تجویز کرتا تھا اور انھوں نے تاریخ، فلسفہ وغیرہ پر بہت سی کتابیں اور طرح طرح کے مقالات لکھے اور سالہا سال تک اپنے نظریات کی اشاعت کرتے رہے۔ بے شبہ اُن کے افکار نے ۱۹۳۱ء کے انقلاب کا راستہ تیار کیا۔ اور اسی سال بلا جنگ جمہوریہ قائم ہوگئی۔ شروع میں یہ مفکر بہت خوش تھے اور جمہوریہ کی حکومت میں حصہ لیتے رہے لیکن جب انتہا پسند انارکسٹ اور اشتراکی جماعتوں کا جمہوریہ میں دخل ہوا اور انھوں نے جمہوری حکومت کے وہ مقاصد بگاڑنے شروع کیے جس کے لیے "نسل ۱۸۹۸ء" جد و جہد کرتی رہی تھی، تو کچھ لوگ خانہ جنگی سے قبل اور خانہ جنگی کے دوران میں اپنے عہدوں سے دست کش اور بالکل بے تعلق ہو گئے۔

سپین کی موسیقی کا خیال آتے ہی، وہاں کی خوش بوئیاں یاد آجاتی ہیں۔ علمائے نباتات کہتے ہیں کہ یورپ کے دس ہزار قسم کے پھولوں میں، نصف سے زیادہ صرف جزیرہ نمائے ہسپانیہ میں اُگتے ہیں ــ اور یہ فقط باغوں میں نہیں ہوتے بلکہ یہاں کے نیم گرم منطقے کے میدانوں میں کھلتے ہیں۔ بنجر زمینیں تک صدہا جھاڑیاں ایسی پرورش کرتی ہیں کہ اُن کے خوشبو دار پھول صاف ہوا کو مہکا دیتے ہیں۔ ملاحوں کا بیان ہے کہ اسپین کی خوشبو اس کے ساحلوں کے نظر سے اوجھل ہو جانے کے بعد دور دور تک سمندر میں پھیلتی ہے۔ اس کی کیفیت بیان کرنی مشکل ہے لیکن وہ ناقابل فراموش ہوتی ہے۔ سپین کی اس خوشبو کے خیال کے ساتھ آپ وہاں کی خوش نوائی اور وہ رقص و سرود یاد کیے بغیر نہیں رہ سکتے جو نشہ آور خوشبو کی طرح سپین کی قربت کا احساس دماغ میں رچا دیتی ہے۔ سپین میں راگ اور ناچ ایک دوسرے کے بالکل لازم و ملزوم ہو گئے ہیں۔ اکثر راگنیاں ناچ کر ہی گائی جاتی ہیں اور بارہا ناچنے والے حرکت کے ساتھ ساتھ گاتے جاتے ہیں۔ عوامی موسیقی میں سپین دنیا بھر میں سب سے بڑھا چڑھا ہے جس کا ایک سبب یہ ہے کہ قدامت پرستی

سکے باعث وہ ان روایات کو سخت اہتمام سے محفوظ رکھتا ہے۔ ہر میلے تہوار میں رنگ برنگ کے مقامی لباس پرانے صندوقوں سے نکال کر پہنے جاتے ہیں اور عجیب عجیب ساز اسی طرح منہ سے، انگلیوں سے یا کمان سے بج کر عیش و مسرت یا رنج و تنہائی کی پر سوز صدائیں بلند کرتے ہیں۔ جا بہ جا سانگ کے ساتھ دلی جوش سے ناچے جاتے ہیں۔ کسی گاؤں کی دھواں بھری سرائیں، یا چوک میں یا کسی ندی کے کنارے سبزہ زار میں، ہر طرح کے ساز، ستار، طنبورہ، بین، بانسری چکارا، کھڑتال کی آوازیں اور کبھی صرف تال یا چٹکی بجنے یا پاؤں مارنے کی آواز آپ سنیں گے جو خاص سپین کے بے شمار قدیم اور مقبول عام ناچوں کے ساتھ ساتھ بلند ہوتی ہیں۔ ان کے بیسیوں نام ہیں جیسے (jota, malaguena, fandango, rueda, sevillana, petenera, rondena) وغیرہ وغیرہ) اور ان میں سے بعض اندلسیہ، ولایات باسک یا اور کسی خاص ولایت سے مخصوص ہیں۔ بعض ناچ آہستہ اور یکساں تھاپ پر ناچے جاتے ہیں، بعض تیز اور زور کی تھاپ پر، جن میں جوش اور شادمانی بھری ہوتی ہے۔ بعض پر سوز بلکہ سوگواری کی کیفیات سے لبریز ہوتے ہیں۔ مذہبی عبادات یا عشق بازی اور ظرافت کے خاص خاص ناچ الگ ہیں۔ راگنیوں کی تعبیر بھی ہر مقام میں عموماً دوسرے طریق پر کی جاتی ہے۔ ولایت ارغون میں جوتا (Jota) کا ناچ قستالیہ یا مرقیہ میں اسی نام کے ناچ سے مختلف ہوتا ہے۔ اندلسیہ میں فندانگو جس طرح ناچتے ہیں دوسرے مقامات میں اس طرح نہیں ناچا جاتا۔ شاید آپ ضرور اندازہ لگالیں گے کہ اندلسیہ ناچ گانے میں سب جگہ سے فائق ہے۔ اس امتیاز کا سہرا ایک حد تک جپسیوں کے سر باندھا جائے گا۔ کہ اگرچہ بہت سے اندلسی ناچ ان کی ایجاد نہیں ہیں لیکن تال میل کے شعور اور احساس کی شدت نے انھیں اعلیٰ درجے کا رقاص بنا دیا ہے۔ "فلیمنکو" ناچ اور گانے خاص طور پر انھیں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لفظ کے معنی، آپ کو یاد ہوگا کہ (فلیمش سے) اجڈ، گنوار کے آنے لگے تھے اور چونکہ اہلِ سپین جپسیوں کی حرکات سے بہت بیزار ہوتے تھے، یہ لفظ انھی کے واسطے بولا جانے لگا تھا۔ یہ موسیقی ہنگری کی جپسی موسیقی سے بہت مشابہ ہے اور اس میں باری باری سے شادمانی،

شکوہ اور خوف کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے اور بیچ میں یکایک تناؤ کے وقفے آجاتے ہیں۔ فلیمنکو ناچ مجمع کے درمیان ناچا جاتا ہے اور تماشائی ہر گت پر ہاتھ کی تالی اور پاؤں کی تھاپ سے آسرا دیتے اور اسی لَے میں تعریف کرتے جاتے ہیں (جیسے "اولے" بہ معنی بہت اچھا، شاباش، مکرر وغیرہ)، ناچنے والا اکثر انھی کی تال یا چٹکی کی آواز پر حرکت کرتا ہے۔ ناچنے والیاں پورے تنگے پہنتی ہیں اور اس میں کپڑے یا سفید زری کی سنجاف کی پٹیاں لگی ہوتی ہیں اور ہاتھ اور گردن پر بھی اسی طرح کے زری کے حاشیے ہوتے ہیں۔ لمبے لمبے بُندے کانوں سے لٹکتے ہیں، ایک کان کے اوپر پھول اُڑس لیتی ہیں۔ اندلسی عورتیں، فربہ اور سن رسیدہ ہونے پر بھی خوب ناچتی ہیں۔ ان کا ناچ فقط پاؤں اور ٹانگوں سے نہیں جسم کے سبھی اعضا خصوصاً ہاتھ اور پاؤں سے ہوتا ہے۔

ایک انگریز اہل قلم اشبیلیہ کے میلے میں ایک فلیمنکو رقاصہ کی کیفیت سناتا ہے۔ یہ ۱۹۴۸ء کا ذکر ہے۔ جب کہ رقاصہ پاستورا امپی ریو کی عمر ساٹھ سال کی ہے:

وہ بیٹھی گانے والوں کو داد دے رہی تھی اور ناچنے پر مائل نہیں معلوم ہوتی تھی لیکن آخر بغیر کسی ظاہری تحریک کے کھڑی ہو گئی۔ ستار والے سے کچھ کہا اور ہاتھ کھلے چھوڑ کر باقی بدن پر شال لپیٹ لی۔ تار کی پہلی گونج پر تھوڑی دیر آنکھیں بند کیے کھڑی رہی لیکن گت تیز ہوئی تو اس نے آنکھیں کھولیں اور اب ان میں سے ایک ہرے رنگ کی آگ چمک رہی تھی۔ پھر پاؤں مارنے شروع کیے اور اب گت کے زیر و بم کے ساتھ ایسی کامل مطابقت پیدا کر لی جیسے ہندوستان کے طبلچی اپنی تیز کار انگلیوں یا ہتھیلیوں کی تھاپ سے پیدا کر لیتے ہیں۔ جپسی میں ہندوستانیت ہونے کا ایسا صریحی ثبوت کبھی میں نے نہیں دیکھا تھا— پھر وہ ناگ کی طرح جو دُم پر سیدھا ہو کے پھسلتا ہوا چلتا ہے، آگے کو بڑھی، جسم سیدھا اکڑا ہوا تھا، پاؤں تیز تیز پیہم تھاپ دے رہے تھے۔ ہاتھ بے قراری سے مل جاتے یا تال دیتے تھے اور سر اس طرح جھکا ہوا تھا جیسے کوئی پُراسرار پیام سُن رہی ہے۔ اسی طرح بہتی ہوئی محفل کے چاروں گوشوں کی طرف بڑھتی تھی اور پھر وسط میں پلٹ کر نئی تال شروع کرتی تھی، جس طرح طبلے کی گت بدل جاتی ہے اور اس کی رُکی ہوئی، لرزتی ہوئی تان بلند ہوتی تھی۔ پاستورا کو "فلیمنکو" راگ گانے میں اپنی آواز پر

جس قدر قابو ہے، میں نے ایسا اور کسی کے گانے میں نہیں دیکھا......(کتاب "سپین" از سٹ ویل، لندن ۱۹۵۳)

سپین کے مشہور لحن ساز مینوئل دِفلاّ کی راگنی (El Amor Bruja) "ساحرِ عشق" جو بہت مقبول ہوئی، اسی پاستورا کی تحریک سے تیار ہوئی تھی۔ اس نے دفلاّ سے فرمائش کی تھی کہ ایسا گیت لکھے جسے گایا بھی جا سکے اور ناچا بھی جا سکے۔ اُس نے ساحرِ عشق کی راگنی بنائی۔ یہ دراصل ایک جپسی کہانی پر مبنی ہے، جس میں ایک دوشیزہ کے دو چاہنے والے ہیں اور ان میں سے ایک بھوت ہے جسے لڑکی جادو کے ذریعے بھگانا چاہتی ہے۔ آگے چل کر اسی کو دِفلا نے سنگت پر بجانے کے لیے تیار کیا اس صورت میں وہ اکثر سنی جاتی ہے بخصوصیت سے "آگ پوجا کے ناچ" کی جوش انگیز صورت میں۔

دِفلاّ کی موسیقی میں سپین کی مہک چھپائے نہیں چھپتی۔ وہ ولایت اندلسیہ کا باشندہ تھا، عمر کا زیادہ حصہ اپنے وطن ہی میں گزارا، یہاں کی راگنیوں کو جذب کیا مگر کوئی عوامی راگنی مستعار نہیں لی بلکہ اپنے گیت خود تیار کیے، البتہ اپنی نشاط انگیز چوپائی "کلاہِ سہ گوشہ" میں بعض قدیم اور مقبول فن استعمال کیے ہیں۔ یہ نظم اُس بامزہ کہانی پر مبنی ہے کہ کس طرح ایک بہت ہی عاشق مزاج عدالتی حاکم کو گاؤں کے اندلسی کسان بے وقوف بناتے ہیں۔

دو اور عہد حاضر کے استاد سپین کی روح موسیقی کا جادو جگاتے ہیں: یعنی ال بنِسزِ (I. M. Francisco Albeniz) اور گرینیڈوس (Enrique Granados)

یہ دونوں قیطلونی ہیں لیکن ان کے گیتوں میں اندلسیہ ہی کے جذبات ساری ہیں۔ ال بنز کی بارہ چھوٹی راگنیوں کا مجموعہ "ابیریا" زیادہ مشہور ہے اور اس میں اندلسی ترنم گونجتا چلا جاتا ہے۔ اسی میں "تریانہ" کی جاندار دو ہا یہ (pasodable) نظم اکثر سنی جاتی ہے اور بہترین قطعہ "ال بکین" جپسیوں کے شہرِ غرناطہ کے محلّے ہی سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کی پرسوز لحنیں جپسیوں کے راگ یاد دلاتی ہیں جو وہ گرمی کی راتوں میں گایا کرتے ہیں۔

گرینیڈوس کو بھی اندلسی راگ سے تحریک ہوئی اور ناچ کے چند گیت لکھے لیکن وہ دِفلاّ یا ال بنز کی طرح عام ناچ گانے سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا اور اس کی شہرت کا بڑا سبب ایک

غنائیہ تمثیل "Goyescas" ہے جس کا قصہ مصور گویا کے بعض نقش و نگار دیکھ کر اسے سوجھا تھا۔ جنوری ۱۹۱۶ء میں نیویارک کے میٹروپولی اوپرا میں سب سے پہلی مرتبہ یہ تمثیل دکھائی گئی تو مصنف پہلی عالمگیر جنگ کے بحری خطرات کو خاطر میں نہ لاکر خود امریکا گیا تھا لیکن واپسی میں اس کے جہاز پر تارپیڈو لگا اور وہ بھی ڈوب گیا۔ "گوئس ماس" کو پیانو باجے پر مسلسل بجانے کے لیے بھی مرتب کر لیا گیا ہے اور وہ درخشاں جواہر نغمہ سے مالا مال ہے۔

سپین کے فنون کے ذکر میں گاوزنی یا سانڈوں سے لڑنا بھی شامل کرنا چاہیئے کیونکہ یہ محض سپاہیانہ کھیل نہیں بلکہ قدیم سے روایتی فن بن گیا ہے جس سے اہلِ سپین کے ذوق اور قابلیت کا، کہ وہ کس حد تک اعضا پر قابو اور پھرتیلا پن رکھتے ہیں، پتا چلتا ہے۔ گاوزنوں کے بہت سے داؤں پیچ رقاص سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اس کی کلائی مضبوط، اور اس میں لوچ ہونا چاہیے کہ سُرخ جھنڈی = ملیتا (Muleta,) کے سانڈ کو ہولے دیتے وقت ہنرمندی نظر آئے۔ اسی طرح چلت پھرت میں خوشنمائی اور پاؤں پر پوری قدرت ہونی چاہیے، جملہ اعضا مل کر کام کرتے ہوں۔ اس میں مطلق کوتاہی نہ ہونی چاہیے کیونکہ آخری مرحلے میں جب کہ "میتا دَور" یعنی گاوزن اور سانڈ ایک دوسرے کا سامنا کرتے ہیں، موت کا کھیل ہوتا ہے۔ سانڈ کے سامنے ہونا، ہر لمحہ موت کے قریب آجانا ہے اور جس قدر کوئی گاوزن زیادہ مشاق ہوتا ہے۔ اسی قدر وہ زیادہ دلیری دکھاتا اور سانڈ کو اپنے جسم سے قریب تر لاتا ہے۔

سانڈ کو دنگل میں "باب خوف" سے لاتے ہیں۔ اس کی موت پہلے ہی سے مقرر ہو چکتی ہے کیونکہ گاوزن اسے نہ مار سکے تو بھی لڑائی کے بعد فوراً اسے مار ڈالتے ہیں۔ یہ قانون اس لیے بنایا گیا ہے کہ ایک دفعہ دنگل میں لڑائی کے بعد سانڈ آدمی کے داؤں پیچ سے واقف ہو جاتا ہے اور پھر لال جھنڈی یا زرد اوڑھنی (Cape) کے دھوکے میں نہیں آتا بلکہ سیدھا گاوزن پر حملہ کرتا اور اپنے تیز سینگ اس کے کارچوبی لباس میں گڑو دیتا ہے۔ پہلی دفعہ سانڈ کی لڑائی دیکھنے میں اگر آپ جگہ کا انتخاب کر سکتے ہیں تو اسے رونده کے دو صد سالہ دنگل میں دیکھیئے یہ بہت خوش وضع عمارت ہے اور یہاں کی مقامی

انجمن ان لڑائیوں کا بڑی توجہ سے انتظام کرتی ہے۔ اصل میں جب بادشاہوں اور امیروں نے اس کھیل یا فن کو ترک کیا اور یہ جسپیوں یا غریب غربا کا پیشہ بنا تو اعلیٰ درجے کے پیشہ ور گاوزنوں کی سب سے پہلے رونده میں تربیت کی گئی۔ انھی میں اٹھارویں صدی کا پیڈرو روحرو نامی پیشہ ور گزرا ہے۔ اُس کے بنیترے اور اوڑھنی کے کرتب ابھی تک اس فن کے سیکھنے والوں کو جاننے ضروری ہیں۔ بغیر اس ابتدائی تعلیم کے وہ دنگل میں نہیں اُترتے۔

کہا جاتا ہے کہ سانڈوں سے لڑائی کا طریقہ مُور آٹھویں صدی میں سپین میں لائے تھے لیکن سپین کے وقائع میں سِد (Cid) سب سے پہلا گاوزن مذکور ہے۔ گویا کی کندہ کاری کی تصاویر میں زمانہ قدیم کے پہلوان پیدل یا گھوڑے پر سوار سانڈوں سے لڑتے دکھائے گئے ہیں۔ کبھی بازار کے چوک میں کبھی معمولی کھلے میدانوں میں، اور کبھی دو دو لڑائیاں ایک ہی دنگل میں۔ اسی طرح یہ مصوّر موروں کو دکھاتا ہے کہ وہ اپنے ڈھیلے لبادوں سے وہی کام لے رہے ہیں جو آجکل کے گاوزن اوڑھنی سے لیتے ہیں۔

بادشاہوں کے جشن، شادی، ولادت وغیرہ تقریبات میں سانڈوں کی لڑائی کھیل تماشوں کا جزو ہوتی تھی۔ چارلس پنجم نے اپنے بیٹے فلپ ثانی کی پیدائش کے موقع پر خود وِلا دولد کے دنگل میں ایک سانڈ کو ہلاک کیا۔ ایسے شوقین اونچے درجے کے گاوزن (toreadores) کہلاتے تھے۔ عام پیشہ ور آجکل "torero" اور گاوزنوں نیز ان کے مددگاروں کے لیے عمومی اصطلاحیں "Picadores" اور "banderilleros" مروّج ہیں۔ سانڈوں کی لڑائی کا بڑا دنگل ایسٹر کی شام کو کھلتا ہے (اگرچہ نئے کھلاڑی کئی ہفتے پہلے سے مشق شروع کر دیتے ہیں) پھر وسط نومبر تک میڈرڈ، برشلونہ، اشبیلیہ جیسے شہروں میں ہر اتوار کو دنگل ہوتا ہے اور خاص خاص موقعوں پر کسی اور دن بھی بندھ جاتا ہے۔ اشبیلیہ کے مشہور میلے میں تو ہر شام ایک "کوریڈا" یعنی سانڈ کی لڑائی لڑی جاتی ہے۔ چھوٹے شہروں میں مذہبی میلے تہوار پر یہ معرکے جمتے ہیں۔ اگر بستی اتنی چھوٹی ہے کہ وہاں دنگل کا الگ انتظام نہیں تو بڑے چوک ہی کو چھکڑوں،

گاڑیوں کا حصار باندھ کر کام میں لاتے ہیں۔ عام طور پر یہ لڑائی ۵ یا ½۵ بجے سہ پہر کو ہوا کرتی ہے اور صرف یہی ایک تقریب سپین میں وقت کے مطابق ہوتی ہے کیونکہ اس کا آغاز ایسا رنگین ہوتا ہے کہ اسے چھوڑا نہیں جا سکتا۔ جس وقت وہ عہدہ دار جو دنگل کا صدر کہلاتا ہے، اپنے مقررہ جھروکے میں آتا ہے تو تری بجتی ہے اور سامنے سے دو سردار گھوڑوں پر سوار سولھویں صدی کی پوشاک میں کلغی دار ٹوپیاں اور ڈھیلی قبائیں پہنے دنگل کو طے کرکے آتے اور اس کی سلامی اتارتے ہیں۔ پھر تین "میتا دور" (قاتل، گاوزن) جنھیں آج اپنا کمال دکھانا ہے سامنے آتے ہیں۔ ان کا لباس آدمی کو مبہوت کر دیتا ہے یعنی "تنگ پاجامہ جس کے گھٹنے اور کمر پر لیس ہوتی ہے"، تنگ صدری، شانوں پر بڑے بڑے گچھے۔ کپڑے مختلف رنگ کے اور ان پر سونے چاندی کا کام اور کثرت سے بیل بوٹے بنے ہوتے ہیں۔ اس موقع پر ان کی جو اوڑھنی (Cape) بائیں بازو پر لپٹی ہوئی ہوتی ہے، اسے وہ لڑائی میں استعمال نہیں کرتے۔ ان پر اعلیٰ درجے کا کارچوبی کام کیا ہوتا ہے۔ (اشبیلیہ میں مکارینا کی حضرت مریمؑ کی مورتی ہے وہاں کے مشہور گاوزن، جوس لیتو کی اوڑھنی کا ایک حصہ بھی مورتی کے مخملی پھریرے میں پیوند کر دیا گیا ہے) تینوں پہلوان شانہ بشانہ دنگل کو طے کرکے صدر کے جھروکے تک آتے ہیں۔ ہر ایک کے پیچھے ان کے دو سوار، دو پیادہ مددگاروں کی قطار ہوتی ہے۔ یہ سب صدر کو جھک کر آداب بجا لاتے ہیں اور وہ سانڈ خانے کی کنجی پھینکتا ہے۔ یہ لوگ دنگل میں اپنے اپنے مقام پر واپس جاتے ہیں۔ سانڈ خانے کا قفل کھلتا ہے اور پہلا سانڈ دنگل میں نمودار ہوتا ہے۔

سانڈوں کی لڑائی کو تین پردے کے ناٹک سے تشبیہ دی گئی ہے۔ پہلے حصے میں پکا دور اپنی مریل سی گھوڑیوں پر لمبے بلّم لیے آتے ہیں اور سانڈ کو بار بار حملہ کرنے کے لیے کوچے مارتے ہیں۔ سانڈ کئی گھوڑوں کو زخمی کر دیتا ہے بلکہ پکا دور بھی اس کی زد سے بمشکل بچتا ہے، تب صدر کے اشارے پر کھیل کا یہ پہلا حصہ ختم ہو جاتا ہے اور پھر بنڈر تیرو (یعنی چھڑی والے) گز گز بھر کی چوبی لکڑیاں جن کے سرے پر فولادی نوک ہوتی ہے، لے کر نکلتے ہیں۔ یہ نوکیں جھلائے ہوئے

سانڈ کی گردن میں، لکڑی کی چار جوڑیوں سے گھپوئی جاتی ہیں۔ ان ظالمانہ زخموں سے سانڈ کی گردن کے رگ پٹھے ڈھیلے اور نیچے ہوجاتے ہیں اور وہ اور زیادہ غضب ناک بھی ہوجاتا ہے۔ کھیل کا یہ حصہ پانچ منٹ میں ختم ہوجاتا ہے۔ اور اب گاوزن ("میتادور" یعنی قاتل) میدان میں نکلتا ہے۔ اسے حریف کو مارنے کے لیے پندرہ منٹ دیئے جاتے ہیں۔ وہ اگر صاحبِ ذوق ہے تو اوڑھنی سے بھی بڑی خوبصورتی سے کام لیتا ہے۔ اپنے آپ کو موت کے جوکھوں میں ڈال کر سانڈ سے کبھی اِدھر کبھی اُدھر حملے کراتا ہے۔ اگر سانڈ کے سینگ کبھی گاوزن کے پُرتکلف لباس تک پہنچ کر کھونچا ماریں تو تماشائیوں کو بے حد لطف آتا ہے۔ آخر میں جب میتادور سانڈ کا کام تمام کرنے کے لیے سُرخ جھنڈی اور تلوار سنبھالتا ہے تو اس کی ہر جنبش میں کامل استقامت اور صحت ہونی لازم ہے، تاکہ جس وقت سانڈ لہراتی جھنڈی پر جھپٹ کر حملہ کرے اور گردن جھکا کر حریف کو پھینک دینے کے لیے دوڑے تو عین اسی وقت تلوار اس کی گردن کے پار ہوجائے۔ تلوار کا قبضے تک گردن میں گھسنا ضروری ہے کہ پہلی ہی ضرب میں سانڈ ہلاک ہوجائے۔ اسی ضرب کو وہاں "لمحۂ حق" کہا جاتا ہے۔

سپین کے اکثر لڑکے گاوزن بننا چاہتے ہیں۔ آپ ہر جگہ انھیں اوڑھنی اور جھنڈی سے آپس میں یا معمولی گایوں کے ساتھ میدانوں میں اسی کھیل کی مشق کرتے دیکھیں گے۔ لوگ سناتے ہیں کہ جپسیوں کی بستی تریانہ سے، جوآن بلمونت، جب کہ لڑکا ہی تھا، دو دوستوں کے ساتھ ندی پار کرکے اشبیلیہ میں رات کے وقت پہنچتا۔ اوڑھنی، تلوار اور لالٹین ایک تختے پر الگ بہا کر لاتا کہ خشک رہیں اور پھر شہر کے کسی گھیر میں جہاں لڑائی کے سانڈ رکھے جاتے تھے، جاکر کسی جھٹے سانڈ کو جگاتا اور لڑائی کی مشق کیا کرتا تھا۔ ساتھی لالٹین لیے روشنی دکھاتے تھے۔

بعض اوقات بارہ برس کے لڑکے تک پیشہ ور میتادور مان لیے گئے ہیں لیکن عموماً مبتدی کو چھ سات برس تعلیم دی جاتی ہے اور وہ اس سے بڑی عمر میں جاکر ہی ماہرِ فن تسلیم کیے جاتے ہیں۔

پھر یہ ابتدائی تعلیم بھی سخت مشقت چاہتی ہے اور دنگل کے واقعی خطرات اس کے علاوہ رہے۔ لڑائیوں کے موسم میں میتا دوروں کو ملک بھر میں دور دور جانا پڑتا ہے اور اکثر وہ ایسے وقت پہنچتے ہیں کہ فوراً دنگل میں نکل آتے ہیں۔ لڑائی کے وقت دھوپ نکلی ہوئی ہو تو گاوزن پہلے ہی معرکے میں پسینہ پسینہ ہو جاتا ہے اور پھر دوسری لڑائی کے انتظار میں جب کہ تیز ہوا چلتی ہے، سائے میں کھڑا رہنا پڑے تو تھرتھری چھوٹ جاتی ہے۔ دوسری لڑائی نہ لڑنی ہو تو بھی اکثر وہ ایسے سانڈ کے مارنے کے لیے اندر بلایا جاتا ہے جس نے اس کے ہم پیشہ کو زخمی کر دیا ہو یا اندیشہ ہو کہ زخمی کر دے گا۔ عام طور پر ایک سہ پہر کے دنگل میں تین میتا دور چھ سانڈوں کا خاتمہ کرتے ہیں۔ اگر میتا دور ناتجربہ کار یا مضمحل ہے، اس کا ہاتھ کانپتا ہے یا ٹھیک تلوار نہیں چلاتا تو تماشائی اسے چڑاتے، ستاتے، خالی بوتلیں، تکیے یا جو کچھ ہاتھ پڑے اُس پر پھینکتے ہیں لیکن اگر وہ صاحب فن ہے، طرح طرح کے کرتب دکھاتا اور پھر بڑی صفائی سے تلوار سانڈ کی گردن کے پار کر دیتا ہے تو حاضرین بہت خوش ہوتے اور عوام اسے آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ اس کی گاوزنی کے ہر ہوٹل، چائے خانے وغیرہ میں چرچے ہوتے ہیں اور کوئی بڑی لڑائی جیتا ہے تو اس کا افسانہ اور خود میتا دور سپین کی داستانوں کا ایک جزو بن جاتا ہے۔

باب شانزدہم

سپینی قوم

سپین کے ایک حصے کے باشندے اپنی عادات اور رسم ورواج میں دوسرے حصوں کے رہنے والوں سے کس قدر مختلف ہیں، اس بارے میں بہت کچھ قلم فرسائی کی گئی ہے۔ کیونکہ سیاحوں کو وہاں کے رنگ برنگ کے طور طریق اور عجیب عجیب جزئیات دیکھنے اوران کا فرق بیان کرنے میں مزہ آتا ہے۔ بے شبہ سپین کے لوگوں میں ایسے اختلافات موجود ہیں۔ بایں ہمہ ان کی بہت سی قومی خصوصیات ایسی ہیں کہ آپ سارے ملک میں گشت لگائیں تو بخوبی دیکھ لیں گے کہ خطہ واری اختلافات کے باوجود بنیادی طور پر وہ سب یکساں ہیں۔

اول تو آپ غالباً رائے قائم کریں گے کہ اکثر سپینی اچھی شکل کے ہوتے ہیں۔ بہت سے مبصر انھیں یورپ کی سب سے خوبصورت قوم قرار دیتے ہیں۔ دوسرے کوئی شبہ نہیں کہ وہ نہایت خوش لباس ہیں۔ اچھے کپڑے پہن کر صاف ستھرے اور شکیل نظر آئیں۔ اس غرض کے لیے بڑی زیر باری گوارا کرتے ہیں۔ عام طور پر ان کا قد متوسط، خال وخد واضح، رنگ صاف، سانولے کی بجائے سفیدی مائل ہوتا ہے۔ وطن میں دھوپ کی شدت اور سرد ہواؤں کی وجہ سے کبھی کبھی آپ ان کے چہرے پر چھتیاں یا جھرّیاں پڑی دیکھیں گے۔ آنکھیں بہت اچھی، پُرمعنی اور پتلی عموماً بادامی، کبھی کبھی بھوری یا سبزی مائل ہوتی ہیں اور یہ رنگ خوبصورتی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ آنکھوں میں جتنی زیادہ چمک ہو گی اُسی قدر زیادہ موروں کے خون کی آمیزش کا پتہ دے گی۔ اُن کے بال بالعموم کالے ہوتے ہیں لیکن

کہیں کہیں بادامی، سُرخ یا سنہری سر بھی آپ کی نظر پڑیں گے۔ عورتیں مردوں سے زیادہ قبول صورت ہیں جس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ خانہ جنگی نے بہت سے صحت منداور وجیہہ صورت کے مردوں کو کم کر دیا۔ سپین کی دوشیزہ اپنی دل کش آنکھ، چمکتے رنگ، توانائی نشست و برخاست اور خوش خرامی کی بنا پر ہمیشہ ممتاز اور دل رُبا ہوگی۔ یہ صحیح ہے کہ مختلف خطوں میں شکل وصورت اور بدن کی ساخت میں آپ فرق دیکھیں گے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ باسکوں کی ناک بڑی ہوتی ہے۔ گلیشیہ والے آئرستانی معلوم ہوتے ہیں۔ قستالیہ والے اکثر دبلے پتلے، قیطلونی اور بلنشیہ کے لوگ بھاری بھر کم، قد آور۔ جس کا سبب شاید یہ ہے کہ قستالیہ کی وسطی سطح مرتفع کی زمین ایسی زرخیز نہیں بلکہ وہاں کی پیداوار کم ہے۔ لہذا قیطلونی ان سے زیادہ کھاتے اور ان سے چوڑے ہاڑ کے ہوتے ہیں مگر اہلِ سپین کی غذا میں ایک یکسانی ایسی ہے جسے آپ بھول نہیں سکتے۔ اور وہ یہ ہے کہ صوبائی اختلافات اور ہر جگہ طرح طرح کے کھانوں کے باوجود یہاں سب کھانے زیتون کے تیل میں پکائے جاتے ہیں۔ تازہ اور باسی کھانے دونوں میں آپ کو اس تیل کی ایسی بُو آئے گی کہ آپ اس درخت کے باغات اور ملک بھر میں اس کے نفیس و سرسبز قطعات یاد کر کے حیران رہ جائیں گے کہ یہ ناخوشگوار بھبکے اس درخت سے منسوب ہوتے ہیں۔ اندلسیہ کا ایک دیہاتی کھانا "گزپکو" سارے ملک میں مقبول ہوگیا ہے۔ یہ ترکاری کا سالن ٹماٹر، ککڑی، مرچ، سرکہ ڈال کر زیتون کے تیل میں پکایا جاتا ہے۔ ایک اور کھانا "پیلا" بلنشیہ کا خاص پکوان اور ملک بھر میں وہاں سب سے اچھا ہوتا ہے۔ اسے زیتون کے تیل میں چاول ڈال کر پکاتے ہیں۔ زعفران سے رنگ، پیاز اور مرچ سے چاشنی دیتے ہیں، چوزے اور مچھلی کے ساتھ قیمہ اور مٹر شامل کرتے ہیں۔ گیشیہ کے باورچی مشہور ہیں وہاں کا خاص کھانا زیتون کے تیل، مرچ پیاز میں تلی ہوئی کٹ (=اوجھڑی) اور باسکوں میں اسی طرح پکائے ہوئے گھونگے ہوتے ہیں۔ زیتون کے تیل میں کڑھالی کی تلی ہوئی بام مچھلی

سارے شمالی ساحل پر نعمت سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک قسم کی پوری جسے چرّو کہتے ہیں ایک قومی غذا بلکہ روایت بن گئی ہے، زیتون کے تیل میں تلی جاتی ہے۔ اسے چاکولیٹ میں ڈبو کر کھانے کا دستور ہے۔ کہتے ہیں الفانسو سیزدہم سپین کی قدیم رسم کا پابند اور اسی طرح ڈبو ڈبو کے چرّو کھایا کرتا تھا۔ اس کی بیوی انگلستان کی شہزادی تھی۔ ایک دن اُسے اتنی گھن آئی کہ رہا نہ گیا اور بگڑ کر بولی کہ "انگلستان میں کوئی مزدور بھی اپنی روٹی چاکولیٹ کی پیالی میں نہیں ڈبوئے گا"، بادشاہ چرو کو اسی طرح گھولتے ہوئے بولا "اور دیکھنے کی بات یہ ہے کہ سپین میں بادشاہ یہ کام کرتا ہے۔

بہرحال آپ کو خاص سپینی کھانے مطلوب ہیں تو زیتون کے تیل میں پکے ہوئے کھانے پڑیں گے۔ لیکن اگر اصلی پکے اور خوش ذائقہ زیتون کھانا چاہتے ہیں تو ان ہوٹلوں اور طعام خانوں میں جانا ہوگا جہاں بیرونی سیاحوں کے لیے کھانے تیار کیے جاتے ہیں اور ملکی تلن سے بہت کم کام لیا جاتا ہے۔

سپین کی روزمرہ زندگی کے بیان میں تین اصطلاحیں لانا لازمی ہے۔ بسئتۃ (= قیلولہ) ترتولیہ (= گپ شپ) اور پاسیو (= سَیر گشت)، پہلا تو وہ کامل سکون ہے جو سپین کے سب سے مصروف کاروباری شہر میں بھی، دوپہر کے کھانے کے بعد تین گھنٹے یا زیادہ وقت تک طاری ہوتا ہے اور نہایت آباد اور بارونق شہر کو اجاڑ گاؤں کی طرح خاموش اور سنسان بنا دیتا ہے۔ شہری یا دیہاتی سب کے سب یکساں طور پر قیلولہ کرنے" گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ اگر کسی دن دوپہر بعد ذرا گرم وقت میں آپ کو دیہات میں سفر کرنے کا اتفاق ہو تو ایک نہ ایک کاشتکار یا راہ گیر درخت یا جھاڑی یا کسی چٹان یا دیوار ہی کے سائے میں (تیز دھوپ سے بچ کر) سوتا ہوا نظر آئے گا۔

"ترتولیہ" سپین والوں کو خدا داد موقع دیتا ہے کہ اپنی طبعی صفت گویائی کا مظاہرہ کریں اور یاروں میں بیٹھ کر، گاوزنی سے شاعری اور سیاسیات تک ہر مضمون پر اپنے خیالات سنائیں

اور احباب کے ایسے جلسے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کسی کے ذاتی مکان کی بجائے اکثر قہوہ خانوں میں جمتے ہیں کیونکہ سپین والے گھر میں خاطر مدارات کرنا پسند نہیں کرتے، سوائے دولت مند، وضع دار لوگوں کے جو اپنے وسیع مکانات میں دعوتیں دیتے اور جلسے کرتے ہیں عام سیاح کی خاطر مدارات اس کے سپینی شناسا عموماً قہوہ خانے یا ہوٹل میں ہی کیا کرتے ہیں۔ بجز اس کے کہ کوئی خاندانی رشتہ یا دوسرے بہت گہرے تعلقات کسی کے گھر کو اس کے لیے خانۂ بے تکلف بنا دیں۔ تیسرا شغل "پاسیو" چھوٹے شہروں یا بستیوں میں شام کے وقت سیر گشت ہے، جب کہ بڑے بازار یا چوک میں ایک طرف لڑکیاں اور عورتیں دو دو تین تین مل کر ٹہلتی ہیں اور دوسری طرف مرد اسی طرح ٹولیوں میں گشت لگاتے ہیں۔ نوجوان مرد و عورت بار بار ایک دوسرے کے قریب سے گزرتے ہیں تو ان موقعوں پر کوئی نیم تبسم یا ایک نگاہ بغیر منہ سے کچھ کہے راہ و رسم محبت کی ابتدا کرنے میں سازگار ہو جاتی ہے۔ اس گشت کے بعد شہروں میں تو برقی روشنی میں ان بازاروں کی جہاں ہوٹل اور بڑی دکانیں ہیں، رات گئے تک چہل پہل رہتی ہے لیکن چھوٹی بستیوں میں جلد اندھیرا اور خاموشی چھا جاتی ہے۔

سیر گشت میں مذکورہ دیدہ بازی، لڑکیوں کے باب میں اہل سپین کے پورے رویے کا پتا دیتی ہے۔ یہاں جوان لڑکیوں کو وہ آزادیاں حاصل نہیں جو آج کل امریکا میں ہو گئی ہیں۔ بلکہ قریب قریب ہر جگہ، سپین کی لڑکیوں کے ساتھ ابھی تک کوئی نہ کوئی بڑی بوڑھی یا خادمہ ضرور ہوتی ہے، حال میں امریکا سے سرکاری (فوجی) مدارس کے طلبہ کا ایک تربیتی جہاز موسم گرما کے گشت میں سپین کی شمالی بندرگاہ سنتاندر میں لنگر انداز ہوا۔ زیر تربیت افسروں نے ایک جلسۂ رقص کا انتظام کیا۔ جس میں مقامی لڑکیوں اور ان کی ساتھ والیوں کا بھی بہ تعداد مناسب بلاوا تھا۔ اول تو مہمان وقت مقررہ سے دو ڈھائی گھنٹے بعد آدھی رات کو آئے اور پھر ہر خاندان کی لڑکی کے ہمراہ ان کے باپ یا بھائی بھی آ پہنچے۔ حالانکہ ان کا بلاوا

نہ تھا۔ اتنی تاخیر اور زائد اشخاص کے آجانے کے باوجود خبر آئی کہ جلسہ کامیاب رہا۔
لیکن اگر یہ امریکی جہاز سپین کی کسی جنوبی بندرگاہ میں آتا تو غالب یہ ہے کہ ایسا جلسہ بالکل نہ ہوسکتا تھا کیونکہ وہاں والدین اپنی لڑکیوں کو کسی ایسے جلسے میں جانے کی اجازت نہ دیتے جو اجنبی نوجوانوں کی طرف سے کیا جا رہا تھا خواہ اس میں کتنی ہی ساتھ والیاں شریک ہو جاتیں۔ اشبیلیہ اور دوسرے جنوبی شہروں کی لڑکیاں ابھی تک قریب قریب گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتی ہیں اور جب تک کوئی گھر کا بڑا ہمراہ نہ ہو کوچہ و بازار میں بھی کبھی نہیں نکلتیں۔ میڈرڈ، برشلونہ جیسے بڑے شہروں میں نوجوان عورتیں جو نوکریاں کرتی ہیں یا کسی یونیورسٹی میں کسی فن کی تعلیم پا رہی ہیں اتنی سخت قیود کی پابند نہیں رہیں۔ وہاں نوجوان مرد و عورت کے درمیان حجاب کم ہو گیا اور میل جول بڑھ گیا ہے۔ بایں ہمہ ہمارے ملک (امریکا) کی طرح عام طور سے سپین میں کوئی دوشیزہ نوجوانوں سے تنہا ملاقات کا وقت نہیں ٹھیراتی، نہ اس کے ساتھ اکیلی ہوٹلوں اور تماشا گاہوں میں جاتی ہے۔ رقص و سرود یا چائے وغیرہ کی دعوتوں میں وہ لڑکوں سے ملتی بھی ہے تو کوئی ساتھ والی ضرور ہوتی ہے۔ اسی طرح کوئی نوجوان تماشا گاہ یا سینما دکھانے لے جائے تو اس کے ساتھ کوئی نگراں یا بڑی بوڑھی عورت ضرور ہوگی۔

تاہم زمانے کے آثار کہتے ہیں کہ خاندانی زندگی کی یہ قیود بہ تدریج ختم ہو رہی ہیں اور قدیم سپین کے طور طریق بدلتے جا رہے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ پچھلی پشت میں یہاں والدین اپنے بچوں کو پیار سے "تو" کہہ کر بات کرتے تھے اور اس کے مقابلے میں بچوں کو اُستد (Usted) یعنی آپ کہنا سکھایا جاتا تھا مگر اب انھی خاندانوں میں پوتے تک اپنے ماں باپ بلکہ دادا دادی تک کو "تو" کہہ دیتے ہیں، جنھیں ابھی تک تعظیمی لفظ "اُستد" سننے کی توقع ہوتی ہے۔ اصل میں سپین کے رسم و رواج پر پہلے کبھی بیرونی اثرات کا ایسا حملہ نہیں ہوا تھا جیسا آجکل دیکھا جاتا ہے کیونکہ اتنی کثیر تعداد

ہیں امریکا و یورپ کے سیاح نہیں آتے تھے۔ اب جدھر دیکھیے ہوٹل اور سرکاری انتظام میں بہت اچھی سرائیں سیاحوں سے بھری ہوئی ہیں۔ بڑی سڑکیں اچھی بن گئی ہیں، ان کے ذریعے اور ادھر اُدھر جانے والی بعض بہت واہیات سڑکوں سے بھی یہ پردیسی دور دور چکر لگاتے اور ان بعید مقامات تک پہنچتے ہیں، جہاں صدیوں سے طرزِ معاشرت میں بہت کم تبدیلی ہوئی ہے اور جہاں کسی بیرونی سیلانی کا آنکلنا ایسی عجیب بات ہے کہ گاؤں کے لڑکے غول کے غول اسے آگھیرتے اور اس کے پیچھے ہولیتے ہیں۔ سیاحوں کے طور طریق اور ان کی آمد سے نفع ہونے کے علاوہ، امریکا کے ہوائی اور بحری اڈے بھی سپین کی سرزمین میں قائم ہوگئے ہیں، اور اہلِ سپین پران کا لازماً اثر پڑے گا۔ کیونکہ ان مرکزوں میں بڑی بڑی عمارتوں کی تعمیر، پھران کی نگہداشت کے لیے سپینیوں سے کام لیا جائے گا۔ اِدھر یہاں جو امریکی عملہ یا فوجی مقیم ہوں گے ان کے طرزِ عمل سے امریکی مذاق سے اچھے بُرے پہلو آشکارا ہوں گے۔ ان سب بیرونی اثرات کے ماسوا خود اہلِ سپین کی بے اطمینانی کو بھی خیال میں رکھنا چاہیے، جو ایک حد تک خانہ جنگی کا نتیجہ ہے کہ صدہا افراد کھیت اور چھوٹی بستیاں چھوڑ چھوڑ کر مستقل کام اور زیادہ کمائی کرنے کی امید میں بڑے شہروں میں آبھرے ہیں۔ شہر کی سکونت تھوڑے ہی دن میں دیہات والوں کی روش اور ان کے خاص رنگ کی دلچسپ رسوم و عادات کو بدل دیتی ہے۔ سپین کے کسان میں ایسی تبدیلی معاشرے کا نقصان ہوگی کیونکہ اس وقت یہ کسان یورپ بھر میں شرافت کا سچا نمونہ ہے۔ وہ مفلس و نادار اتنا ہے کہ اکثر ایک ہل یا خچر کا مالک بھی نہیں ہوتا۔ اس کی کھیتی کے طریقے بھی بالکل پرانے دقیانوسی ہیں۔ اس کی بیوی اور لڑکیاں کھیت میں اس کے ساتھ کام کرتی اور اپنے کپڑے قریبی ندی پر جاکے پتھروں ہی کو میز بنا کے خود دھولیتی ہیں۔ وہ بعض اوقات بالکل ناخواندہ بھی ہوتا ہے —— ان سب باتوں کے باوجود اس کی خداداد گویائی، اپنے دیس کی واقفیت، خودداری، تواضع اور سب سے بڑھ کر ذاتی دیانت اسے بڑا امتیاز بخشتی ہیں۔ عموماً وہ فنونِ لطیفہ کا قدرتی ذوق رکھتا ہے۔ اندلسیہ

ہیں تو کسان، گڈریے، خچر والے جس طرح بولتے ہیں اسی آسانی سے گیت بنا لیتے ہیں، اور ہر اندلسی ستار (یا چھیتارا) بجانا جانتا ہے۔

بعض اوقات سپین کو یورپ کا سب سے اچھا اور سچا جمہوری ملک کہا گیا ہے، کیونکہ وہاں امیر، غریب، مدبر، دکان دار، کاریگر سبھی کی دل چسپی اور گفتگو کے موضوع یکساں ہوتے ہیں اور دنگل میں، ریل میں، کسی میلے میں یا قہوہ خانے میں وہ ان پر بے تکلف باتیں کرتے ہیں۔ اس قسم کا میل جول اسی وقت ممکن ہے کہ لوگ قوم میں اپنی جگہ ہونا نہیں بھولتے اور یا جیسے کچھ ہیں اس پر شرمندہ یا دل میں شاکی نہیں ہوتے۔ یہاں کا کاریگر اپنے پیشے پر اسی قدر فخر کرتا ہے، جتنا کوئی امیر کبیر اپنے خطابات پر، اور کوئی بھی دوسرے سے اپنی جگہ بدلنا نہیں چاہتا۔ مشترکہ برادری کا یہ جذبہ اور شخصیت کے اہم ہونے کا یہ احساس اہل سپین کی طبائع میں اتنا راسخ ہے کہ خاندانی ناموں کے رکھنے سے بھی اس کا اظہار ہوتا ہے۔ اپنے امتیاز کو حتی الامکان قائم رکھنے کے لیے سپین والا باپ کے نام کے ساتھ ماں کا نام بھی عرفی نام کے طور پر اپنے نام میں لگا لیتا ہے۔ باہر والوں کو اس طرز تسمیہ سے اول اول اُلجھن ہوتی ہے۔ لیکن یہ آسانی سے سمجھایا جا سکتا ہے۔ مثلاً مصور گویا کا پورا نام فرانسسکو گویا یے لوسئیں تس تھا (ماں کا نام ہمیشہ آخر میں ہوتا ہے) اگر یہ مصور چاہتا تو صرف ماں کا نام استعمال کرتا جیسا ایک اور نامی مصور اور نیز ایک شاعر نے کیا۔ اس دوسرے مصور کا رسمی نام تو (Diego Rodriguez de Silvey Velasquez) تھا کیونکہ اس کا باپ ایک پرتگالی امیرزادہ تھا۔ لیکن ماں اشبیلیہ کے ولاس کوئز خاندان سے تھی اور یہ لوگ اسی شہر میں رہنے لگے تھے۔ چونکہ ماں کا نام اشبیلیہ میں زیادہ معروف تھا، غالباً اسی لیے ولاس کوئز نے فقط ماں کا نام اختیار کر لیا۔ شاعر لورکا نے کسی وجہ سے صرف ماں کے نام کو ترجیح دی ورنہ اس کے باپ کا نام گارسیا تھا۔ لیکن بعض اوقات یہاں کے لوگ ماں باپ دونوں کا نام لازم ملزوم کر دینا پسند کرتے ہیں۔ جیسے ابانز ناول نویس جو ہمیشہ اپنے آپ کو "بلاسکو ابانز" کہلوانا چاہتا تھا۔ ناموں میں

اشتراک کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ ماں کا اصلی نام شادی کے بعد بدل جاتا ہے تو بیٹا بھی اس کے خاندانی نام کے بجائے شادی کے نام پر موسوم کردیا جاتا ہے۔
ڈون اور ڈونہ (بہ معنی عالی جناب) کا استعمال بھی اہل سپین کی ذہنیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ گذشتہ صدیوں میں یہ تعظیمی الفاظ صرف شاہ و شہریار یا بڑے امرا کے لیے مخصوص تھے لیکن سپین والوں کی تواضع اور دوسری طرف اس بات کا شوق کہ لوگ اُن سے تعظیم وتکریم کا برتاؤ کریں، اس لفظ کو رفتہ رفتہ عام سطح پر لے آیا کہ اب آپ کسی عزت دار مرد یا عورت کو ڈون یا ڈونہ سے خطاب کر سکتے ہیں۔ البتہ یہ لفظ بغیر ان کے اصلی نام لیے کبھی استعمال نہ کرنا چاہیے۔ آپ چاہیں تو عرفی یا خاندانی نام بھی بڑھا دیں لیکن اصلی نام کو کبھی حذف نہ کرنا چاہیے۔

اسی طرح ایک اور اصطلاح Hidalgo سپین والوں کے طرزِ فکر کی غمازی کرتی ہے۔ یہ Lijo de algo کا مخفف ہے جس کے معنی "فلاں شخص کا بیٹا"، اور منشا کسی معزز باپ کا فرزند ہے۔ گو یہ اعزاز کسی خاندانی امارت کی بنا پر نہ ہو۔ سروِنتیس نے اپنے سورما "ڈون کوِک زٹ" کو "ہِدال گو" بنا کر بڑھاوا دیا ہے حالانکہ اس کی آمدنی اور خاندانی حیثیت ایک غریب زمیندار کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ شاہ سپین کو یہ اختیار حاصل تھا کہ اپنی رعایا کے کسی فرد کو اجازت دے کہ وہ اپنے نام کے ساتھ "ہدال گو" استعمال کرے۔ چنانچہ یہ اعزاز حاصل کرنے کی بہت اشتیاق سے کوشش کی جاتی تھی اور وہ عموماً کسی بہادری یا ہمت کا کارنامہ دکھانے پر عطا کیا جاتا تھا۔ زمانہ حاضرہ کے ایک سپینی فلاسفر کا قول ہے کہ "ہدال گو" سے دنیاوی دولت و ثروت کا مالک ہونا مراد نہ لینی چاہیئے۔ بلکہ اسے نیکی کی دولت کا مالک سمجھنا چاہیئے۔
اہل سپین کے طریق عمل میں یہی خودداری اور ذہنی کیفیت جھلکتی ہے۔ آجکل دوا روی کے سیاح بھی سپین والوں کا کوئی نہ کوئی ایسا قصہ ضرور سناتے ہیں جس میں

کسی معمولی دکان دار، ٹیکسی چلانے والے یا ہوٹل کے نوکر نے ان کا بلا غرض کوئی کام کر دیا یا اعلیٰ درجے کی دیانت کا ثبوت دیا۔ حقیقت میں سپین کے غریب، ادنیٰ درجے کے لوگ عموماً متواضع ہوتے ہیں اور دوسروں کی مجبوری سے کوئی فائدہ اُٹھانا اپنی شرافت کے خلاف جانتے ہیں۔ ”پن دونور“ (pundonor) کا یہ احساس یہاں کے تین کروڑ باشندوں کے قریب قریب ہر فرد میں پایا جاتا ہے۔ اگر اہل سپین میں شرافت یا خوبی کا جو تصوّر ہے، اس کا خلاصہ ایک لفظ میں بیان کر سکتے ہیں تو وہ یہی ”پن دنور“ ہے، جس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ کوئی دوسروں سے اپنی ایسی عزت کرانے کے معاملے میں شدید الاحساس ہو جس کا وہ اپنے کردار کی بلندی کے باعث مستحق ہے۔ یہ لفظ فرد کے اس وقار اور شخصیت پر حاوی ہے جس کا تحفظ کرنے کے لیے وہ جان کی بازی لگا سکتا ہے۔ دوسروں کی توجہ کے مطالبے میں لفظ پن ڈونور کسی قدر کبر وناز کا مفہوم رکھتا ہے۔ اس لفظ کو ڈرامائی نسبت بھی حاصل ہے۔ سٹیج پر یا علاوہ ازیں اُسے کئی ہسپانوی المیہ کہانیوں کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اگر آپ ان لوگوں کے ذہن کو سمجھتے ہوں جو پنڈونور (عزتِ نفس) کی خاطر جیتے اور مرتے ہیں تو پھر آپ ہسپانیہ اور ہسپانویوں کے صحیح قدر دان ہیں۔

بچّوں کی تربیتِ اخلاق اور تعمیرِ کردار کے لیے

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ	۱/-	شیرِ میسور	۲/۲۵
” موسیٰ کلیم اللہؑ	۱/۷۵	مولانا محمد علی جوہر	۱/۷۵
” عیسیٰ ابن مریمؑ	۱/۵۰	سعدی شیرازی	۱/۵۰
” یوسفؑ	۱/-	قائداعظم محمد علی جناح	۱/۷۵
سرورِ کائنات (صلی اللہ علیہ وسلم)	۲/۷۵	نپولین اعظم	۲/-
حضرت عمر فاروقؓ	۲/۷۵	خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ	۲/-
” عثمان غنیؓ	۲/-	مولانا رومؒ	۲/-
” خالدؓ	۲/-	غوث پاکؒ	۱/۷۵
” خدیجہ کبریٰؓ	۱/۷۵	فریدالدین گنج شکرؒ	۲/۱۲
” عائشہ صدیقہؓ	۱/۵۰	حضرت گنج بخشؒ	۱/۷۵
” فاطمہ زہرہؓ	۲/۱۲	خواجہ اجمیریؒ	۲/۷۵
اکبر	۱/۷۵	محمود غزنویؒ	۱/۷۵
جہانگیر	۲/-	ظہیرالدین بابر	۲/۱۲
شاہ جہان	۱/۷۵	ہمایوں	۲/-
اورنگ زیب	۱/۷۵	شیر شاہ افغان	۲/۲۵
بہادر شاہ ظفر	۲/-	حالیؒ	۱/۷۵
کمال پاشا	۱/۷۵	سرسیدؒ	۱/۵۰
سید احمد شہیدؒ	۱/۵۰	سیرت و کردار	۱/۷۵
غالب	۱/۷۵	شیرِ اسلام	۱/۷۵

شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، پشاور، حیدرآباد، کراچی

مشہور مہمات سائنس	ترجمہ	محمد فاروق	۲/۵۰
میرے اندر کیا ہے	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۱/۵۰

بنیادی سائنس کا سلسلہ

(بہترین آفسٹ طباعت رنگا رنگ تصاویر)

(مطبوعہ ایران)

انسانی مشین	ترجمہ	مولانا صلاح الدین احمد	۱/۵۰
آواز	//	//	۱/۵۰
پرندے	//	//	۱/۵۰
پھول پھل اور بیج	//	//	۱/۵۰
چاند	//	//	۱/۵۰
حرارت	//	//	۱/۵۰
روشنی	//	//	۱/۵۰
زندہ اشیاء	//	//	۱/۵۰
ستاروں سے آگے	//	//	۱/۵۰
کشش ثقل	//	//	۱/۵۰
کیڑوں کی سماجی زندگی	//	//	۱/۵۰
مٹی	//	//	۱/۵۰
مشینیں	//	//	۱/۵۰
مقناطیس	//	//	۱/۵۰
موسم	//	//	۱/۵۰

مطبوعات فرینکلن پوسٹ بکس ۳۶۵ ، ۶۶ ، مزنگ روڈ ، لاہور

فنی معلومات

(ذیل کی کتابیں بھی رنگین تصویروں سے مزین ہیں)

بجلی کی پہلی کتاب	ترجمہ	سید علی ناصر زیدی	۲/۵۰
ٹیلی فون کیسے کام کرتا ہے	ترجمہ	خلیق ابراہیم خلیق	۱/۲۵
خلاء میں سفر کی پہلی کتاب	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۲/۵۰
طیاروں کی پہلی کتاب	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۲/۵۰
موٹروں کی پہلی کتاب	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۲/۵۰

تاریخ

تاریخ بھی مزے کی چیز ہے (تصویردار)	ترجمہ	مولانا عبدالمجید سالک	۱/۵۰
سو تاریخی واقعات (تصویردار)	ترجمہ و ترتیب	مولانا غلام رسول مہر	۷/-

سوانح

سو بڑے آدمی (تصویردار)	ترجمہ و ترتیب	مولانا عبدالمجید سالک	۵/-
غریب لڑکے جو نامور ہوئے (مصور سرورق)	ترجمہ و ترتیب	مولانا عبدالمجید سالک	۴/-
لڑکیاں جو نامور ہوئیں	ترجمہ / ترتیب	اختر عزیز احمد / مولانا عبدالمجید سالک	۵/-
مشہور موجد اور اُن کی ایجادیں	ترجمہ	ابوالحسن نغمی	۲/۷۵

ہماری دیگر مطبوعات

(والدین اور اساتذہ کی رہنما مصور کتابیں)

(یہ سب کتابیں تصویردار ہیں)

آپ کے بچے کی وراثت	ترجمہ	شاہد احمد دہلوی	۱/۰
بچوں کی بدتمیزیاں	"	"	۱/۰
بچوں کے کھیل	"	"	۱/۵۰
بچے کی اخلاقی قدریں	"	"	۱/۵۰
کامیاب باپ	"	"	۱/۵۰
معاشرتی زندگی میں بچوں کی رہنمائی	"	"	۱/۵۰

صحت اور طب

بچہ اور اس کی دیکھ بھال	تصویردار	ترجمہ	ڈاکٹر محمد عبدالقوی لقمان	۶/۵۰
آپ کے بچے کی صحت	تصویردار	ترجمہ	شاہد احمد دہلوی	۱/۶۲
بیماری کے جذباتی اور نفسیاتی پہلو		ترجمہ	سیّد وقار عظیم	۱/۶۲
اتفاقات جو عظیم طبّی کارنامے بن گئے		ترجمہ	ڈاکٹر محمد عبدالقوی لقمان	۵/-

سیاست

اقوام متحدہ	ترجمہ	فضل حق قریشی	۴/۰
امریکہ کا سیاسی نظام	ترجمہ	مولانا صلاح الدین احمد	۲/۵۰

مذہب و اسلامیات

خدا ہمارے ساتھ ہے	ترجمہ	مولانا صلاح الدین احمد	۱/۲۵
خدا موجود ہے	ترجمہ	پروفیسر عبدالحمید صدیقی	۲/۵۰
اسلام اور قانون جنگ و صلح	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۹/۰

تعلیم و تعلّم

آزاد تعلیم اور جمہوری نصب العین	ترجمہ	سید وقار عظیم	۳/۰
بچے کی تعلیم میں گھر اور مدرسے کا تعاون	ترجمہ	فضل محمد خاں	۸/۰
تعلیم کے مقاصد	ترجمہ	ڈاکٹر سید محمد عبداللہ	۵/۵۰
مدرسے کی زندگی میں بچے کی رہنمائی	ترجمہ	سید وقار عظیم	۱/۶۲
والدین اور معلمین	ترجمہ	شاہد احمد دہلوی	۱/۵۰

انسانیات

مستقبل کا انسان	ترجمہ	سید قاسم محمود	۶/۰
ثقافت کا مسئلہ	"	"	۱/۰
قدیم تہذیب اور جدید انسان	"	"	۳/۵۰
قدیم علوم اور جدید تہذیب	ترجمہ	سید ہاشمی فرید آبادی	۱/۰

تاریخ

انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	
جلد اول، تاریخ اسلام	"	"	۱۲/۰
جلد دوم، تاریخ عالم	"	"	۱۲/۰
جلد سوم	"	"	۱۴/۰

تاتاریوں کی یلغار	ترجمہ	عزیز احمد	۱۲/-
صلیبی جنگیں	ترجمہ	سید رئیس احمد جعفری	۵/-
عرب دنیا	ترجمہ	ڈاکٹر محمود حسین	۱۲/-
...یں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۶/-

سوانح

ایڈیسن	ترجمہ	محمد سعید	۳/۵۰
چند عظیم علمائے جراثیم	ترجمہ	عبدالمجید قریشی	۱۰/-
سقراط	ترجمہ	آنسہ صبیحہ حسن	۲/۵۰
غازیان تہذیب	ترجمہ	سید ہاشمی فرید آبادی	۵/-
سلطان صلاح الدین ایوبی	ترجمہ	پروفیسر محمد یوسف عباسی	۱۷/۵۰
نور محل	ترجمہ	شبلی ایم کام و حبیب اشعر دہلوی	۷/۵۰

معاشیات

آبادی کا مسئلہ	ترجمہ	شبلی ایم کام	۱/۵۰
خوراک کا مسئلہ	ترجمہ	" " "	۱/۵۰
عظماء کے معاشی نظریات	ترجمہ	ڈاکٹر ایس ایم اختر	۶/-

فلسفہ

داستانِ فلسفہ	ترجمہ	سید عابد علی عابد	۱۶/-
ناقابلِ تسخیر ذہنِ انسانی	ترجمہ	محمد صفدر میر	۲/۵۰
فلسفے کی نئی تشکیل	ترجمہ	انتظار حسین	۲/-

مطبوعات فرینکلن، پوسٹ بکس ۳۶۹، ۶۶۔ مزنگ روڈ، لاہور

فنونِ لطیفہ

شاہکار تصاویر	ترجمہ و ترتیب	سید امتیاز علی تاج	۷/۵۰

جغرافیہ اور سیاحت

عرب اور اہلِ عرب	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۶/۰
نیویارک سے پیرس تک پہلی پرواز	ترجمہ	گروپ کیپٹن فیاض محمود	۳/۵۰
یہ ہے شمالی افریقہ	ترجمہ	سید عابد علی عابد	۲/۵۰

ناول، افسانے، ڈرامے

انجان راہی	ترجمہ	شان الحق حقی	۳/۵۰
بادبان	ترجمہ	سید قاسم محمود	۶/۰
بشر ہے کیا کہیے	ترجمہ	سید عابد علی عابد	۶/۵۰
پہلا خون	ترجمہ	غلام حسین	۲/۵۰
چنگیز خاں کے سنہرے شاہین	ترجمہ	اشفاق احمد	۶/۰
دھوپ چھاؤں	ترجمہ	ولی اشرف صبوحی	۷/۰
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے	ترجمہ	سید رئیس احمد جعفری	۳/۵۰
شہر پناہ	ترجمہ	ابن انشا	۲/۵۰
گھاس کا سمندر	ترجمہ	سید قاسم محمود	۱/۵۰
قیامت کی رات	ترجمہ	سید عابد علی عابد	۷/۰
معذور	ترجمہ	سید رئیس احمد جعفری	۴/۰
ننھی بی بیاں	ترجمہ	حجاب امتیاز علی	۵/۵۰

نئے پُرانے	ترجمہ	محمد یوسف عباسی	۴/۰
ہمیں چراغ ہمیں پروانے	ترجمہ	قرۃ العین حیدر	۱۰/۰
ویران ہے دل	ترجمہ	قیسی رامپوری	۶/۰
اندھا کنواں	ترجمہ	ابن انشا	۷/۵۰
انوکھی کہانیاں	ترجمہ	شاہد احمد دہلوی	۵/۰
بڑا ریچھ	ترجمہ	ولی اشرف صبوحی	۳/۵۰
پاپ کی نگری	ترجمہ	سیدہ نسیم ہمدانی	۶/۰
حیرت ناک کہانیاں	ترجمہ	شاہد احمد دہلوی	۴/۰
قصص الحمرا	ترجمہ	سید وقار عظیم	۷/۵۰
خزانے کی تلاش	ترجمہ	شبلی ایم کام	۲/۵۰
سورج کے ساتھ ساتھ	ترجمہ	عشرت رحمانی	۶/۵۰
لاکھوں کا شہر	ترجمہ	ابن انشا	۳/۵۰
ایک حمام میں	ترجمہ	عشرت رحمانی	۳/۰
پھول کی پتی، ہیرے کا جگر	ترجمہ	ہلال احمد زبیری	۶/۰

نئی کتابیں

آدمی کی انسانیت	ترجمہ	مولانا محمد بخش مسلم	۷/۵۰
فلسفے کا نیا آہنگ	ترجمہ	بشیر احمد ڈار	۳/۵۰
کائنات اور ڈاکٹر آئن شٹائن	ترجمہ	میجر آفتاب حسن	۱/۷۵
مشرق و مغرب کو ملنا ہی پڑے گا	ترجمہ	سید ہاشمی فرید آبادی	۱/۷۵
کیا سائنس ہمیں بچا سکتی ہے	ترجمہ	پروفیسر عبدالواحد	۱/۷۵

مؤسسہ مطبوعات فرینکلن، پوسٹ بکس ۳۶۹، لاہور